مقالات خطیب اعظمؒ

حصہ اول

مذہب کی واپسی

ہم کو اپنے کو خوش نصیب قرار دینا چاہئے کہ ہمارے اس عہد میں مذہب کی واپسی کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ مذہب کی واپسی کے عمل کے ظاہری اور غیبی محرکات ہیں۔ انسان ہر طرح کے اصولوں کو آزما چکا۔ ہر فلسفہ کو اپنا چکا۔ ہر پابندی کو قبول کر چکا۔ ہر طرح کی مطلق العنان آزادی اور بے راہ روی پر گامزن ہو چکا مگر ڈھاک کے تین پات والی صورت حال برقرار رہی۔ نہ چین تھا نہ چین ہے، نہ چین ملنے کی امید ہے۔ سکون کا پیاسا دردر مارا پھرا مگر نہ صرف پیاسا رہا۔ بلکہ اس کی پیاس میں شدت کا اضافہ ہوتا گیا۔ آخر کار تھکا ہارا انسان اس مذہب کے گھاٹ کی طرف واپس ہونے لگا۔ جس کو چھوڑ کر اور چھوٹا سمجھ کر سراب کے وسیع وعریض میدان کی طرف اس کی وسعت اور چمک دمک دیکھ کر چلا آیا تھا۔ گھاٹ پھر گھاٹ ہے۔ بنے ہوئے راستے ہی سے آنا جانا پڑتا ہے۔ مگر سراب میں جدھر چاہو چلو کوئی پابندی نہیں ہے۔ اسی سرابی آزادی نے انسان سے مذہب کا گھاٹ چھڑایا تھا۔ آج سیراب کی حقیقت کی معرفت ہی نے مذہب کی واپسی کا عمل شروع کرایا ہے۔

حقوق انسانی کے سفر کا آج کا آخری سنگ میل ''اقوام متحدہ'' کرب کدہ بنا ہوا ہے۔ عیاری، جوڑ توڑ، مکر وفریب کا گڑھ ہے۔ اور سارے اعمال بد انسانی فلاح انسانی حقوق کے نام پر انجام دیئے جارہے ہیں جس طرح شکاری ہی چارہ ڈالتا ہے اسی طرح

بڑی طاقتوں نے عالمی بینک عالمی امداد عالمی قرض، عالمی عدالت، سلامتی کونسل وغیرہ کے چارے ڈال رکھے ہیں جس کے ذریعہ چھوٹی قوموں کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً ان کے خام مال پر قبضہ کرنا۔ پھر ان ہی کے ہاتھ ان کے مال کے مصنوعات کو گراں قیمت پر بیچنا، بھوکے انسانوں کو ہتھیار فراہم کرنا تا کہ وہ اپنے ہی لہو کو پئیں، اپنے ہی گوشت کو کھائیں اور اپنے ہاتھوں مر جائیں۔ ان کی سرزمین پر حفاظت علمی مدد، فنی تربیت کے نام پر قبضہ کرنا، مالکوں کو غلام بنا کر کام لینا، یہ اور اسی طرح کے ظالمانہ کام اقوام متحدہ کے ذریعہ آج کے مکار انسان انجام دے رہے ہیں جس پر پڑتی ہے وہ محسوس کرتا ہے۔ جو ابھی چارہ کھانے میں مشغول ہے وہ فکر مستقبل سے بے نیاز ہے اور مگن ہے۔ جب چارہ ختم ہوگا تب محسوس کرے گا۔ اس عالمی عیار خانہ کے خلاف صرف ایران ہے جو حقائق کو بے نقاب کرتا رہتا ہے۔ اکیلا مظلوموں کو متحد ہونے کے لیے پکارتا رہتا ہے، چونکہ ایران کا جسم وقلب ودماغ سب مجروح ہو چکا ہے لہٰذا اس کو پوری طرح ہر مظلوم کے دکھ درد کا احساس ہے۔ اور اسی احساس کو وہ اپنے خون کی قیمت میں ہر مظلوم کے خون میں دوڑا دینا چاہتا ہے۔ کچھ کو ہوش آنے لگا ہے۔ کچھ کان کھڑے کرنے لگے ہیں۔ کچھ نے سفر شروع کر دیا ہے۔ لیکن صدیوں کے عالمی استحصال کے مقابلہ مین ایران کی چند سالہ کوششیں ابھی محسوس بھی نہیں ہوتی ہیں۔ جب کہ سارے ذرائع ابلاغ ایران کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں اور ایران نے اپنے لہو کے قطرات کے گرنے کی آواز کو اپنا ذریعہ ابلاغ بنا رکھا ہے۔ فی الحال اور کوئی ذریعہ اس کے لئے ممکن بھی نہیں۔ بہر حال یہ ایرانی لہو کی ٹپ ٹپ انسانوں کو جگا رہی ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ پہاڑہ جتنا بڑھتا ہے حاصل ضرب اتنا ہی زیادہ آتا ہے دو کا دوگنا چار ہوتا ہے اور ہزار کا دوگنا دو ہزار ہوتا ہے۔

گنا نہیں بڑھتا ہے وہ دوگنا ہی رہتا ہے مگر دو کا حاصل صرف اکائیوں میں گنا جاتا ہے اور ہزار کا حاصل ضرب ہزاروں اور لاکھوں میں گنا جاتا ہے اسی طرح کام کا آغاز مشکل ہوتا ہے۔ رفتار سست ہوتی ہے۔ ماحصل کم ہوتا ہے۔ قربانی شدید وعظیم ہوتی ہے۔ لیکن جب کام چل نکلتا ہے تو مکہ کے تیرہ سال کے مسلمان تین سو بھی نہیں ہوتے ہیں اور مدینہ کے دس سال کے مسلمان لاکھوں ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انشاء اللہ وہ دن دور نہیں ہے جب مذہب کی واپسی کا یہ ہلکا پھلکا عمل جو اس وقت سست رفتاری سے جاری ہے وقت آنے پر سیلابی اور طوفانی بنے گا۔ یہ مذہب کی واپسی کے ظاہری محرکات کی طرف چند اشارے تھے جو اس تحریر میں کئے گئے اور غیبی محرک جو اصلی محرک ہے وہ عہد ظہور مہدیؑ کی روز بروز قربت ہے۔

چنانچہ کل جن باتوں کا سناتا۔ بتانا ناممکن تھا آج وہ شوق سے سنی اور سمجھی جارہی ہیں۔ جن باتوں سے کل روکنا ناممکن تھا اور مذہب خس وخاشاک کی طرح بدکرداری کے سیلاب میں بہتا دکھائی دے رہا تھا۔ آج اس سیلاب سے نفرت ہو چکی ہے مذہب جسے کل خس وخاشاک سمجھا جاتا تھا آج اسی سے نشیمن کی تعمیر کی جارہی ہے۔ انسان کی فطری محبت وفطری نفرت اجاگر ہو رہی ہے۔ ایسے موقع پر فطرت کی صحیح راہ نمائی بے حد ضروری ہے بے حد مفید ہے اور یہ رہبری سوائے اسلام کے سوائے اقوال معصومؑ کے۔ سوائے احکام معصومؑ کے کوئی نہیں کرسکتا۔

لیکن اس تاریخی حقیقت سے ایک سکنڈ کے لیے آنکھ بند نہ ہونا چاہئے کہ جتنے ظلم شاہی وشاہنشاہی نے کئے۔ اس سے زیادہ ظلم آزادی جمہوریت سوشلزم، کمیونزم نے کئے ہیں اور ان سب نے مل کر جتنے ظلم کئے ہیں مذہب کے نام پر مذہب کی آڑ میں وہ

سارے مظالم عیار مذہبی سربراہوں نے کئے ہیں۔تمام مذاہب نے جتنی برائیاں غلطیاں اور مظالم کئے ہیں ان کی ساری نظریں اسلام کے دامن پر بھی موجود ہیں یعنی واقعات وحالات وتاریخ کے آئینہ میں مذہبیت ولا مذہبیت۔ مادیت وروحانیت،شاہی وآزادی سرمایہ داری اور کمیونزم سب کی صورت بالکل ایک طرح کی ہے اور یکساں ہے۔

صرف صدیوں کا عالمی مظلوم یعنی دین اہلبیت علیہم السلام جو دین الٰہی ہے جو دین محمدی ہے۔ جو اصلی اسلام ہے جو کسی تاریخ کو اپنی تاریخ ماننے پر تیار نہیں ہے۔اس کی تاریخ چودہ مظلوم معصوموں کی تاریخ ہے یا ان شہداء، علماء، صالحین اور متقی افراد کی تاریخ ہے جنہوں نے اپنی فکر کو اپنے علم کو اپنے ذہن کو اپنے عقیدہ کو فکر معصوم کے تابع رکھا اور جنہوں نے عمل کی دنیا میں ہر سانس لینا اسی وقت جائز سمجھا جب اس کے جواز کو معصوم کی سند حاصل ہوئی مختصر یہ کہ تاریخ مذہب اہلبیتؑ ۱۴ر معصوموں کی تاریخ ہے۔علماء، شہداء، صالحین کی تاریخ ہے۔کسی شیعہ حاکم کی تاریخ بھی نہیں ہے چاہے وہ مصر میں رہے ہوں یا ایران میں یا ہندوستان میں۔

ساری تاریخ میں صرف یہی تاریخ ہے جس کے دامن پر غیر کے خون کے دھبے نہیں ہیں اس لئے اس کے جسم پر غیروں کے لگائے ہوئے بے حساب زخم ضرور ہیں۔لہٰذا نشر حقوق کے ساتھ پوری قوت کے ساتھ نشر مذہب اہلبیت علیہم السلام بھی ضروری ہے۔ ورنہ اگر قانون نافذ نہ ہوا تو قانون کا کوئی فائدہ نہیں تاریخ دین اہلبیت علیہم السلام میں قانون حقوق بشر ہمیشہ نافذ رہا ہے، اور آج کا اسلامی ایران پھر اسی نفاذ کے لئے قربانیاں دے رہا ہے۔

آخر کلام میں اس بنیادی بات کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ قوت نافذہ نہ قانون

سازاداروں کے پاس ہے نہ انتظامیہ اور عدلیہ کے پاس ہے نہ قومی حکومت کے پاس ہے نہ بین الاقوامی تنظیموں اور اداروں کے پاس نہ نام مذہب میں ہے نہ اسلام کے نام میں۔ اول وآخر قوت نافذہ وعقیدہ خدا وآخرت میں ہے۔اسی عقیدہ سے مذہب اہلبیتؑ شروع ہوتا ہے۔اسی کے مطابق اس نے صدیاں طے کی ہیں اور اسی عقیدہ کے ذریعہ پوری انسانیت کو سکون دینے والا ظہور کرنے والا ہے۔عہد ظہور، عہد ظہور نہیں ہے۔ بلکہ بے چین انسانیت کی عالمی آرامگاہ ہے جس پر عقیدہ خدا وآخرت سایہ فگن ہے۔

باتیں بے حد اچھی ہوں تب بھی بیکار ہیں جب تک باتیں کرنے والے خود کو اچھائی کا نمونہ نہ بنالیں۔کیا ہم غلامان اہلبیتؑ علیہم السلام نے اپنے کو نمونہ بنانے کا ارادہ کرلیا ہے اگر ارادہ کرلیا تو بسم اللہ عمل شروع ہوجانا چاہئے۔

سماجی مذہب یا حقیقی مذہب

زندگی کے بہاؤ کا نام سماج ہے بہاؤ پانی کی فطرت ہے لیکن بہاؤ کو حد کے اندر بھی رکھا جا سکتا ہے اور حد سے باہر بھی بہنے کا موقع دیا جا سکتا ہے۔ بہاؤ تیز بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی رفتار کو کم بھی کیا جا سکتا ہے۔ بہاؤ کو تقسیم بھی کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح دریا سے بڑی نہر اور بڑی نہر سے چھوتی نہریں نکالی جاتی ہیں۔ اور بہاؤ کو یکجا بھی کیا جا سکتا ہے جیسے مختلف دریاؤں کو ایک دریا میں ملا دیا جاتا ہے۔ بہاؤ کو کبھی روکا بھی جاتا ہے، اور کبھی رکاوٹوں کو دور بھی کیا جاتا ہے۔ کبھی پانی کی سطح اونچی کی جاتی ہے، کبھی سطح کو نیچا لایا جاتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ پانی کی فطرت ہے نشیب کی طرف بہنا لیکن اس فطرت کو سلیقے کے ذریعے مفید بنایا جا سکتا ہے اور بیش از بیش فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اور بد سلیقگی کے باعث پانی کا فطری بہاؤ بے شمار تباہیاں بھی لا سکتا ہے۔ فطری اور اس کے استعمال کا سلیقہ دو چیزیں ہیں۔ فطرت میں انسانی عمل کو دخل نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ خالق کی طرف سے عطا ہوتی ہے لیکن اس کے استعمال کا سلیقہ وہ کام ہے جس میں انسانی عمل کو بڑا دخل ہے۔ عمل کو بد سلیقگی سے بچانے کے لئے اور سلیقہ سکھانے کے لئے تعلیم وتربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ انسان کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو جائے پھر بھی ناقص ہی رہتا ہے۔ لہٰذا اس کی تعلیم وتربیت بھی ناقص رہے گی۔ اسی بنا پر ہم ہمیشہ اپنے نظام تعلیم، نصاب تعلیم، انداز تعلیم ومقاصد تعلیم پر نتائج تعلیم کے پیش نظر نظر ثانی کرتے

رہتے ہیں۔ کیونکہ انسانی نظریات اور اصول ہمیشہ تجرباتی دور میں رہیں ہیں اور رہیں گے اس انسانی کمزوری کو دور کرنے کے لئے خدا نے مذہب بھیجا۔ کیونکہ کامل کا بھیجا ہوا نظام ابھی کام ہوگا۔ اور جب اس کے لانے والے، سمجھانے والے پھیلانے والے بھی معصومؑ ہیں۔ تو نظام بھی کامل ہے۔ اور اس نظام کی تعلیم وتربیت بھی نقائص سے پاک ہے۔

مذہب اسی لیے آیا ہے کہ انسان میں خواہشات کا پیدا ہونا فطری ہے مگر خواہشات کے اس فطری بہاؤ کو حدود میں رکھنا ضروری ہے ان حدود کے مجموعہ کا نام شریعت ہے اور عربی زبان میں شریعت کے معنی بھی گھاٹ اور کنارہ کے ہیں۔ شریعت کا کام یہی ہے کہ انسانی خواہشات کے ذریعہ پیش از پیش انفرادی اور اجتماعی فوائد حاصل کئے جائیں۔ اور خواہشات کے حریص ہوہوس بن جانے کے بعد جو انفرادی، خاندانی، نسلی، قومی، بین الاقوامی تباہیاں آتی ہیں۔ جن کے اثرات صدیوں اور ہزاروں سال باقی رہتی ہیں کہ تباہیاں تباہیوں کو پیدا کرتی رہتی ہیں بلکہ تباہیوں کا شجرہ چل پڑتا ہے اور تباہیوں کی نسلیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ان عظیم وعریض وطویل تباہیوں سے انسان کو اور انسانی معاشرہ کو بچانا بھی دین اور شریعت کا کام ہے۔ لیکن شریعت کا فائدہ اسی وقت حاصل ہوگا اور دین کا مقصد اسی وقت پورا ہوگا۔ جب انسان کی انفرادی زندگی اور انسانی معاشرہ دین اور شریعت کا پابند ہوگا۔

مگر بجائے اس کے کہ ہم اور ہمارا سماج مذہب کا پابند ہوتا ہم نے دین کو اپنی خواہشات کا پابند بنانے کے لئے سماج کو مذہب پر حاوی کر دیا ہے آج ہم مذہب سے بالکل آزاد ہو چکے ہیں۔ ہر حرام حلال ہے۔ ہر واجب ترک ہے ہر مستحب مکروہ ہے۔ اس کے برخلاف سماج جس مباح بلکہ حرام کام کو واجب کر دے اس کا بجالانا واجب ہے۔ ہم

مذہب شعور کھو چکے ہیں۔ جہالت عیب ہے۔ مگر دین سے جہالت کا اظہار اعلیٰ سوسائٹی کی ممبری حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ حد یہاں تک آ پہنچی ہے کہ ہم دین کو مانتے ہیں اور اس پر معترض ہونے کو دینی حق تصور کرتے ہیں۔ دینی احکام کا مضحکہ اڑانا اور مسلمان ہونا اگرچہ متضاد باتیں ہیں۔ مگر ہر ترقی پسند مسلمان اس تضاد کا مجسمہ ہے اور تمام مسلمان اسی ترقی پسند مسلمان کا اتباع کرنا اپنے لئے لازم سمجھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سماج میں جس چیز کو واجب سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کو بہر حال انجام دیا جائے گا چاہے مذہب اس کو لاکھ حرام بتائے۔

اس بیماری کا علاج یہ ہے کہ ہم دین کی تعلیم حاصل کریں اور دینی واقفیت کو سماج میں رائج کریں تا کہ سماج اور دین میں کتنا فاصلہ ہے اور کتنا تضاد پیدا ہو چکا ہے۔ اس کا احساس ہمارے سماج کو ہو جائے اور اس احساس کو تعمیری شکل دینے کے لئے لازم ہے کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو حقیقی دین کا پابند بنائیں۔ اس طرح ہم اس سماجی دین سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو سماجی دین نہیں ہے بلکہ وہ بے دینی ہے۔ جس کو سماج نے اختیار کر لیا ہے اور شعور دین کو بے حس و مفلوج رکھنے کے لئے اس بے دینی کو مذہب کا لباس پہنا دیا گیا ہے اٹھئے اور اس لباس کو نوچ کر پھینک دیجئے تا کہ بے دینی کی مکروہ صورت سب کے سامنے آ جائے اور دینی تعلیم کو عام کیجئے۔ تا کہ اس کی روحانی اور پاکیزہ صورت سب کے سامنے آ جائے اور ہمارے معاشرے کا ہر فرد عاشق دین بن جائے۔

رحمت ورنہ عذاب

پرچہ جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا تو ماہ مبارک رمضان شروع ہو چکا ہوگا۔ کچھ مسلمان بغیر روزہ کے رمضان کی توہین کریں گے۔ اور کچھ مسلمان روزہ رکھ کر رمضان کا سامنا کریں گے۔ بہت کم ہوں گے۔

بہت ہی کم ہوں گے وہ مسلمان جو ماہ رمضان کا جون کی سخت گرمی ہیں استقبال کریں گے۔ اگرچہ ہمارے ہادی ورہبری ومولی وآقا جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے تھے مجھے روزہ پسند ہے گرمی کا اور جہاد پسند ہے تلوار کا۔

جناب عیسیٰؑ نے اپنی مادر گرامی کو زندہ کر کے پوچھا آپ دنیا میں واپس آنا چاہتی ہیں یا نہیں تو آپ نے فرمایا ضرور واپس آنا چاہتی ہوں لیکن صرف اس لئے کچھ نمازیں سخت ٹھنڈی راتوں میں پڑھ سکوں اور کچھ روزے سخت گرم دنوں میں رکھ سکوں۔ جناب مریم سخت روزہ اور مشکل نماز کا استقبال کر رہی ہیں اور مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام سخت گرمی کے شدید روزہ کے لئے پرشوق نظر آتے ہیں۔ کیا حضرت علیؑ اور جناب مریم کے اقوال صرف سن لینے کے قابل ہیں۔ اور یہ کہنا کافی ہے کہ قابل تعریف ہیں یہ اقوال یا خوب فرمایا ہے یا ایمان میں تازگی اور جلا پیدا ہوتی ہے ان اقوال سے یا یہ تو حضرت لی فرما سکتے تھے یا اس فقرہ سے آپ کے جذبہ عبادت وراہ خدا میں آپ کی مشکل پسندی واضح ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ تعریفی اقوال اور ریمارک سے نہ ان حضرات سے

عقیدت ووابستگی کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ ان اقوال ہی کا حق ادا ہوتا ہے۔حق ادا کرتا ہے تو ان اقوال کا ہمارے اندازفکر پراور رفتارعمل پر اثر پڑنا چاہیے۔یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ہم کو شکرخدا ادا کرنا چاہیے کہ ہم کو ایک عظیم عبادت کی انجام دہی کا موقع مل گیا اور ہم کو غیر معمولی ثواب حاصل کرنے اور اپنے گناہوں کو معاف کرانے کا موقع مل گیا۔احکام خدا کی تعمیل سے فرار آج مزاج مسلم بن گیا ہے۔نماز ہے تو سرپٹ پڑھی جارہی ہے نہ قرأت درست نہ سانس درست نہ قیام وقعود درست نہ واجبات ادا نہ ارکان کی واقفیت۔ نماز کیا پڑھ رہے جیسے کسی دوسرے کی طرف سے پڑھ رہے ہیں کہ کسی طرح ختم ہو۔نماز پڑھتے وقت معلوم ہوتا ہے کوئی پیچھے ڈنڈا لئے دوڑا آتا ہے لہٰذا جی جان چھوڑ کر تیز سے تیز نماز پڑھی جارہی ہے۔سچ ہے شیطان توہمات کا ڈنڈا لئے دوڑا آرہا ہے تاکہ کہیں جذبہ عبودیت ان کو اپنی گرفت میں نہ لے لے۔ہم نماز میں بھی شیطان ہی کی اطاعت کررہے ہیں یہ ہے ہمارے بدنصیبی کی حد۔فطرہ کم سے کم قیمت کا نکلے اور کم سے کم نکلے بلکہ نہ نکلے تو بہتر ہے۔زکوٰۃ کسی نہ کسی طرح واجب نہ ہونے پائے۔خمس سے بچ نکلیں اور بچ نکلنے کے لئے تاریخ خمس سے پہلے خرچ کرلیں۔کسی کو قرض دیدیں۔غرضکہ کچھ کرلیں مگر فطرہ زکوٰۃ خمس سے فرار کا موقع مل جائے۔یہ اور اسی طرح کی بہت سی مثالیں اس کا ثبوت ہیں کہ احکام خدا سے فرار آج مزاج مسلم بن چکا ہے۔فرار کی پہلی منزل واجب سے بچ نکلنے کی کوشش ہے اور آخری منزل واجب ترک کرنے کی ہے بلکہ بحث کرنے کی ہے کہ آخر اس گرمی میں اس روزہ کا کیا فائدہ۔اس لیے کہ دنیاوی منفعت،اور مادی فائدہ کے علاوہ تو کوئی فائدہ غیب پر ایمان لانے والے مسلمان کی نظر میں ہے ہی نہیں۔وہ روحانی مذہب کو بھی صرف مادی حد تک مانتا ہے۔نذر چکھنے میں بڑی عقیدت کا

اظہار کرتا ہے۔نذر کھانے میں شفا ثواب سب ہی کچھ مانتا ہے لیکن روزہ رکھنے میں نہ صرف قانون شکن ہے بلکہ قانون صوم پر بھر پیٹ معترض ہے،اور قانون شکنی کا پرجوش حامی ہے لیکن جاہل کا جہالت پر مصر رہنا،مریض کا بدپرہیزی پر جان دینا،بچہ کا ضد کرتے رہنا،بری عادتوں کے لتی افراد کا اپنی عادتوں پر باقی رہنا ہر طرح برا ہے۔قابل مذمت ہے تو مسلمان کا دین سے جاہل رہنا۔احکام دین سے روگردان رہنا۔بے نمازی کا بے نمازی رہنا۔روزہ خوروں کا روزہ خور رہنا۔مال واجبات ہڑپ کرنے والوں کا مال خدا اور سول وامامؑ کو ہڑپ کرتے رہنا بھی ہر طرح برا ہے۔قابل مذمت ہے،قابل نفرت ہے۔لہٰذا تبدیلی آنا چاہیے۔تبدیلی لانا چاہیے۔تبدیلی لانے میں حصہ لینا چاہیے۔

ماہ رمضان رحمت کا مہینہ ہے۔افطاری وسحری کی رحمت سے رمضان کی رحمتوں کو نہ چاہیے۔بلکہ گناہوں کی معافی مل جانا،رکی ہوئی دعاؤں کا قبول ہوجانا،نفس میں نافرمانی سے نفرت پیدا ہوجانا،قلب ودماغ میں خدا کی اطاعت کے جذبہ کا بڑھ جانا،یہ وہ عظیم رحمتیں ہیں جن کی بنا پر یہ مہینہ رحمت کا مہینہ قرار دیا گیا۔اب یہ ہماری توفیق پر منحصر ہے کہ ہم ان رحمتوں کو حاصل کرتے ہیں یا رمضان میں روزہ نہ رکھ کر اپنے لئے عذاب ہی عذاب مول لیتے ہیں۔

حضرت امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں ہر وہ دن عید کا دن ہے جو گناہ کے بغیر بسر کیا جائے اور عید تب ہے جب ہمارے اعمال کو خدا قبول کرلے۔لیکن اگر اعمال ہی نہ ہوں بلکہ بداعمالیاں ہی بداعمالیاں ہوں تو پھر رحمت کے بجائے عذاب ہی عذاب کو ہم سمیٹ رہے ہیں۔کیا کبھی ہم نے سوچا کہ جس دن یہ بے پناہ عذاب ہمارے سامنے

آئے گا اس دن ہمارے لئے نہ طاقت برداشت ہوگی نہ جائے پناہ۔لہٰذا آج ہی ہماری روش بدل جانا چاہئے۔رحمت کے دروازے کھلے ہیں، توبہ کریں اور روزے رکھیں۔ استغفار کریں اوراعمال قبول کرائیں۔

ہم خدا کے بندے ہیں
اور رمضان خدا کا مہینہ ہے

غیر اسلامی خیالات نے آج مسلمان کے ذہن پر اتنا قبضہ کرلیا ہے کہ ہم دین کو ہلکا سمجھتے ہیں ہم کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم دین ہلکا سمجھتے ہیں۔ چنانچہ احکام اسلامی خصوصاً عبادات کا ذکر ہمارے درمیان اس طرح ہوتا ہے کہ جب خدا کا حکم ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور ہونا چاہئے لہٰذا اس عبادت کا فائدہ کیا ہے۔اس حکم خدا کا سبب کیا ہے۔اس کے بعد ہمارا دوسرا قدم اٹھتا ہے کہ ہم احکام الٰہی کا فلسفہ بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔نماز کا فلسفہ، روزہ کا فلسفہ، حج کا فلسفہ، سود، گانا، لہولعب وغیرہ کے حرام ہونے کے فلسفے، وغیرہ وغیرہ۔ بات جب فلسفہ پر آگئی تو ہر انسان کو بولنے، سوچنے کا موقع مل گیا اور دین کھلونا بن گیا۔ حالانکہ ۹۹ رفیصدی صرف احکام بیان ہوتے ہیں اور ایک فیصدی احکام کے اسباب ونتائج بیان ہوئے ہیں۔جبکہ اسباب ونتائج کی روشنی میں ہی فلسفہ مرتب ہوسکتا ہے۔

یہ بات قابل اعتراض نہیں ہے کہ ۹۹ رفیصدی احکام بغیر فلسفہ کے اور بغیر اسباب ونتائج کے تذکرہ کے کیوں بیان ہوتے ہیں۔ساری دنیا کا نظام اسی اصول اور انداز پر ہے ہر معمار، ہر بڑھئی، ہر مستری، ہر انجینئر، ہر ڈاکٹر، ہر وکیل، ہر منتظم مختصر یہ کہ ہر کام کرنے والا، ہر ماہر صرف احکام صادر کرتا ہے کہ یہ لا کر دو، اس طرح کرو، اس طرح

بولو مگر اپنے عمل اور حکم کی وجہ ہر قدم پر بیان نہیں کرتا، بلکہ جب کبھی کوئی ایسا مسئلہ آجاتا ہے کہ وجہ بتلائے بغیر عمل نہ ہوگا یا عمل سست ہوگا یا خرابی پیدا ہوگی تو وجہ بیان کی جاتی ہے اور نتائج سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ مذہب بھی اسی اصول پر صرف احکام دیتا ہے اور اپنے ماننے والوں سے یہ امید رکھتا ہے کہ ایمان کی بنیاد پر ان کو حکم دینا کافی ہے۔ اسباب ونتائج سے آگاہ کرنا ضروری ہے نہ ممکن ہے۔ نہ مناسب ہے۔ البتہ جب ضرورت ہوتی ہے تو اسباب اور نتائج بھی بیان کر دیتا ہے۔ ورنہ ہر عبادت کی بنیاد صرف حکم الٰہی ہے احکام الٰہی کے مجموعہ کا نام شریعت ہے۔ ہم جب معاملات میں عمل کی بنیاد صرف حکم خدا کو قرار دیتے ہیں تو عبادات میں بدرجہ اولیٰ پورے عمل کی بنیاد کو صرف حکم خدا ہونا چاہئے۔ مثلاً ہم سودی معاملات نہیں کر سکتے۔ نکاح اور طلاق میں صیغہ کا جاری کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ طلاق میں گواہوں کا ہونا لازم جانتے ہیں، بوقت طلاق عورت کا پاک ہونا ضروری جانتے ہیں۔ جب ان سارے معاملات کی وجہ اور بنیاد صرف حکم خدا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، جہاد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، تولا، تبرا، اعتکاف، عمرہ، قربانی، وغیرہ میں ہم وجہ تلاش کریں اور وجہ کی بنیاد عبادت قرار دے کر ایک کرور کی چیز کو ایک کوڑی میں فروخت کر دیں۔ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے سے بڑی کون چیز ہوسکتی ہے۔ ہم اس دنیا میں مالداروں، افسران، مشہور افراد، بااثر حضرات علماء، دانشور، والدین، اعزہ، احباب، پڑوسی حتیٰ کہ اپنے ملازم اور نوکر کی خوشنودی کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جس کی جیسی حیثیت ہوتی ہے اتنی اہمیت اس کی خوشنودی حاصل کرنے کو ساری دنیا کے کاموں میں سب سے زیادہ اہم کیوں قرار دیں جبکہ خدا کے بعد جتنے بڑے ہیں نبیؐ، امام سب کی خوشنودی بھی خدا کی خوشنودی کے حاصل ہونے کے بعد

ہی حاصل ہوسکتی ہے۔

لہٰذا عبادات کی وجہ صرف حکم خدا ہونا چاہئے اور عبادت کی انجام دہی صرف خوشنودی خدا حاصل کرنے کے لئے ہونا چاہئے۔ جبکہ یہ خوشنودی نور بالائے نور اور خوشنودی بالائے خوشنودی بھی ہے کہ خدا خوش تو نبیؐ وامامؑ سب خوش ورنہ سب ناراض۔ ایسی صورت میں مثلاً نماز صبح جلد اٹھنے اور سہانے موسم سے لطف اندوزی کے لئے پڑھنا اور روزہ درستی صحت کے لئے رکھنا کروروں کی چیز کو کوڑیوں کے مول کر دینا نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ ایک کرور کی کرنسی کے ساتھ اگر ایک کوڑی بھی ہم رکھ دیں تو اس نازیبا حرکت کو عقل اپنی توہین قرار دے گی۔ اسی بنا پر اگر عبادت میں خوشنودی خدا کے ساتھ کوئی دوسری نیت وجذبہ وخیال واحساس شامل ہوجائے تو خدا ایسی عبادت کو واپس کر دیتا ہے اور ہرگز قبول نہیں کرتا ہے۔

ہم صرف خدا کے بندے ہیں۔ اس کے علاوہ نہ کسی نے ہم کو عقل دی ہے نہ حیات۔ نہ احساس دیئے ہیں نہ جذبات، نہ آج خدا کے علاوہ کوئی روزی دیتا ہے نہ کل اس کے علاوہ کسی کے قبضہ میں موت ہوگی۔ ہماری حاضری بھی اسی کے سامنے ہوگی اس وقت صرف اس کی خوشنودی ہمارے کام آئے گی نہ کوئی کام دے گا نہ کسی کی عقل، نہ کسی کی تقریر نہ نکتہ آفرینی، نہ کسی کی تحریر اور علمی موشگافی، نہ کسی کا شعر کام آئے گا نہ کسی کا ادبی شہ پارہ۔ بلکہ ان سب کی حالت عام لوگوں سے بھی بدتر ہوگی۔ لہٰذا ہر حکم خدا کی تعمیل کیجئے۔ واجب کو ادا کیجئے حرام سے بچئے، مستحب ہو تو شوق ادائیگی پیدا کیجئے۔ مکروہ ہو تو احساس کراہت تازہ دم رکھئے۔ ماہ مبارک آگیا ہے جو کچھ بن سکے اس ماہ میں کر ڈالئے جو کچھ حاصل کر سکتے ہیں اس سے غفلت نہ برتئے۔ روزہ دار کی نیند عبادت ہے، خاموشی

تسبیح ہے۔اس ماہ میں دعائیں قبول ہوتی ہیں، ہرعمل کا ثواب کئی گنا ملتا ہے۔ یہ مہینہ ہمیں صبر کی مشق کراتا ہے۔امیر کو غریب کے دکھ کا احساس دلاتا ہے۔مومنین میں قوت ایثار کو ابھارتا ہے اس مہینہ میں روزی زیادہ کی جاتی ہے مگر صرف مومنین کی روزی نہ کہ بدعقیدہ وبدعمل افراد کی روزی۔اس ماہ میں ۳؍تاریخ کو صحف ابراہیم، ۶؍کو توریت، ۱۳؍کو انجیل، ۱۸؍کو زبور اور شب قدر میں قرآن نازل ہوا ہے۔اس ماہ کے پہلے دس دن رحمت کے ہیں۔دوسرے دس دن مغفرت کے ہیں اور آخری دس دن دعاؤں کے قبول ہونے کا اور دوزخ سے نجات حاصل کرنے کا زمانہ ہیں۔

اوپر لکھی تمام باتیں ارشاد رسولؐ اور ائمہ علیہم السلام کے مطابق لکھی گئی ہیں تا کہ اس ماہ میں جم کر عبادت کرنے، ثواب لوٹنے، دوزخ سے نجات حاصل کرنے اور دعاؤں کو قبول کرانے کا جذبہ ہر روزہ کے ساتھ بڑھتا جائے۔

محرم آرہا ہے

ہمارے سماج کی پریشانیوں میں سے ایک پریشانی یہ بھی ہے کہ محرم آرہا ہے۔بلکہ عورتیں رجب کے مہینہ سے ٹھنڈی سانس لے کر یہ کہنا شروع کردیتی ہیں کہ بس اب محرم ہی خرچ کا زمانہ آرہا ہے۔رجب میں کونڈے کرنا ہیں۔شعبان میں شبرات کرنا ہے۔رمضان میں افطاری، سحری کا انتظام کرنا ہے اگر بے روزہ گھرانہ ہے تو اسے افطاری، سحری کی فکر نہ سہی مگر عید کی فکر تو بہرحال ہوتی ہے۔اور وہ فکر عید میں روزہ داروں سے زیادہ رمضان میں دبلے ہوجاتے ہیں۔اللہ اللہ کر کے رمضان ختم ہوا عید میں بچوں کے کپڑے سینے کے انتظام سے چھٹی ملی تو فطرہ کی فکر کھائے جاتی ہے۔فطرہ ہی وہ خوش نصیب دینی حکم ہے جس پر زیادہ سے زیادہ مومنین عمل کرتے ہیں۔کیونکہ ثواب کے علاوہ فطرہ جان کی حفاظت کرتا ہے۔اور عہد حاضر کا مومن دین کو بھی دنیا کے لئے مانتا ہے۔ جب چاہے تجربہ کر لیجئے۔دس نمازیں، بیس دعائیں، تیس سورے بتائیے جن کے ذریعہ گناہ معاف ہوسکتے ہیں۔ایک مومن بھی آپ سے پوچھنے نہ آئے گا کہ کیا بیان کیا تھا۔ لیکن اگر بیان کیجئے کہ نماز عشاء کے بعد پابندی سے سورہ واقعہ پڑھنے والے کو روزی کی تنگی کبھی نہ ہوگی تو مرد تو مرد عورتیں بچوں کو بھیج کر پوچھیں گی کہ اس سورہ کا نام لکھوالاؤ۔ کس پارہ میں ہے؟ یہ بھی پوچھ لینا۔ہم آپ کو بغیر پوچھے بتائے دیتے ہیں، ستائیسویں پارہ میں ہے۔پڑھ کر دیکھئے انشاءاللہ روزی کی پریشانی نہ ہوگی۔اگر چہ فطرہ کو محافظ جان

ہونے کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہے۔مگر پھر بھی فطرہ اللہ کی راہ میں نکالنا ہے۔ لہٰذامومنین کی سالانہ حساب فہمی کا قومی مظاہرہ فطرہ کی قیمت طے کرتے ہیں ، ہوتا ہے۔فطرہ میں تین کلو گیہوں یا جو دینا ہیں۔جو گیہوں یا جو نہ دے سکے وہ اتنی قیمت دے جتنے فطرہ پانے والا ۳رکلو گیہوں خرید سکے۔فطرہ پانے والا بازار سے خریدے گا۔فطرہ لگانے والا سرکاری غلہ کی دوکان کا نرخ لگائے بیٹھا ہے۔فطرہ لینے والے کو آج خریدنا ہے جبکہ غلہ مہنگا ہو چکا ہے مگر دینے والے نے چونکہ فصل پر سستا خریدا تھا لہٰذا وہ اسی بھاؤ سے قیمت لگانا چاہتے ہیں۔سو کا سیدھا جواب یہ ہے کہ گیہوں یا جو دید یجئے۔ قیمت کے چکر میں نہ پڑئیے۔مگر ماہرین حساب جمع ہوتے ہیں۔ایک کہتا ہے ۵روپیہ ۱۳ر پیسے ہوتے ہیں۔دوسرا کہتا ہے ۵روپیہ ۱۱ر پیسے ہوتے ہیں۔۲۲ررمضان سے بحث شروع ہوتی ہے۔عید گذر جاتی ہے مگر حساب مہارت کا لوہا منوانے والے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔سوچئے اگر دو نئے پیسے خدا کی راہ میں زیادہ ہی چلے گئے تو کیا حرج ہے۔

مگر ریٹائرڈ اکاؤنٹینٹ مُصر ہیں کہ نہیں جناب حساب حساب ہے، جو جَو جَو ہوتا ہے۔بخشش کی بات الگ ہے۔وہ سو سو ہو سکتی ہے مگر کوئی ان سے پوچھے۔آپ اپنے لیے کیا پسند کرتے ہیں خدا جَو جَو کا حساب لے یا سو سو کی بخشش کرے۔جو اپنے لئے پسند کیجئے وہی روش راہِ خدا کے لئے اختیار کیجئے۔مگر ہماری بدنصیبی یہی ہے کہ عید کے لئے کپڑے، جوتے، سوئیاں تک کوشش کر کے اچھی خریدیں گے کہ جب لینا ہی ہے تو اچھی چیز لو۔کچھ پیسے زیادہ لگ جائیں تو بھلے لگ جائیں مگر چیز تو ڈھنگ کی ہو۔مگر فطرہ کے ذریعہ ڈھنگ کا ثواب لینے کی فکر کسی کو نہیں، فطرہ اس طرح دیتے ہیں جیسے ثواب دوسروں کو ملے گا۔اور عید کا سامان اس طرح خریدتے ہیں جیسے جنت بس یہی سامان عید ہے۔

فطرہ نکال کر ایک مہینہ خالی بیٹھے۔کیونکہ خالی کا مہینہ آ گیا۔ہمارے معاشرہ میں خالی کے مہینہ کا بڑا چرچا ہے۔اس میں کوئی خوشی کا کام ہم نہیں کر سکتے۔اگر چہ خدا نے آٹھویں امام کو اسی مہینہ میں پیدا کیا ہے ہمارے گھروں میں بھی خالی کے مہینہ میں بچے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ پیدائش پر ہمارا اختیار نہیں ہے۔ویسے تاریخ پیدائش تو ہمیشہ ہمارے اختیار میں رہتی ہے۔خالی میں پیدا ہونے والا بچہ منحوس نہیں ہے۔۱۱رذیقعدہ کو امام رضا علیہ السلام کی ولادت باسعادت ہوئی۔بڑی خوشی کی تاریخ ہے۔مگر یہ اللہ کے کام میں وہ خالی کے مہینہ میں جو چاہے کر ڈالے مگر ہم بندے اس منحوس مہینہ میں کوئی خوشی کا کام کوئی شادی نیا کام نہیں کر سکتے۔خالی کا مہینہ ان ہی لوگوں کے لئے منحوس ہے جن کے لئے خالق کا مہینہ (رمضان) مبارک نہیں۔ورنہ ہر دن کا مالک خدا ہے جن دنوں کو اس نے نحس بنا دیا ہے۔ان کے علاوہ کسی دن یا مہینہ کو منحوس کرنے کا ہمیں کیا حق۔مگر ہمارے سماج کا ایک جواب ہے جس کا کوئی جواب نہیں کہ سب ٹھیک ہے۔مگر ہمارا دل نہیں بھرتا ہمیں شک آتا ہے۔ہمارے یہاں اس مہینے میں خوشی کا کام نہیں ہوتا۔اس ''ہم'' کا علاج خدا کے پاس ہے مگر اس نے علاج کا ایک دن معین کر دیا ہے۔مگر اس دن کے بعد نہ دوا ہے نہ غذا بس سزا ہی سزا ہے۔

ذیقعدہ کو خالی کا لقب عورتوں نے دیا ہے اور سماج کا پارلیمنٹ اسمبلی کونسل سب عورتیں ہیں جو کچھ یہ پاس کر دیں وہی قانون ہے۔ان کے قانون کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔جو چیلنج کرے وہ پہلے گھر سے پھر خاندان سے، پھر سماج سے نکال باہر کیا جائے گا۔ایسے میں کون نکو بنے، جس طرح انگوٹھا چھاپ منسٹر پڑھے لکھوں پر حکومت جھاڑتے ہیں اسی طرح عورتوں کے ذریعہ جاہلانہ رسوم، جاہلانہ شکوک، جاہلانہ عقیدے، جاہلانہ

مصارف جاہلانہ عقیدتوں کی گرفت سماج پر مضبوط ہے۔

آیئے خالی کی خالی خولی بحث سے آگے بڑھیں خالی کے بعد بقرعید کا مہینہ آگیا بکرے کی یا قربانی کے حصہ کی فکر سب کو ہے کیونکہ قربانی سماج میں رائج ہے۔ اگرچہ مذہب میں سنت ہے۔مگر سماج میں واجب ہے۔ مذہب کا واجب چھوڑا جاسکتا ہے مگر سماج کا مستحب چھوڑنا بھی ناممکن ہے۔ مذہب کے حرام کا ارتکاب بےخوف اور بغیر کسی جھجھک کے زندگی بھر کیا جاسکتا ہے۔مگر سماج کے مکروہ کے بجالانے کی ہمت کسی میں نہیں۔نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس سب چھوٹ جائے مگر عید کی سوئیں اور بقرعید کے ماش چاول نہیں چھوٹ سکتے۔روپیہ نہ ہوتو اس کو حاصل کرنے کے لئے چوری، رشوت، جھوٹ، جیل سب ممکن ہے مگر باراتیوں کو بڑا گوشت کیسے کھلایا جاسکتا ہے۔ ناک کٹ جائے گی۔لوگ تھوتھو کریں گے لڑکی کا معاملہ ہے جیسے بھی ہو کرنا ہے۔ ہاں اللہ کا معاملہ ہو تو دیکھا جائے گا۔کون ابھی قیامت آجاتی ہے۔ اللہ معاف کردے گا مگر بندے نہیں معاف کریں گے لہٰذا سماج کے احکام کی تعمیل کرو اور خدا کے احکام کی توہین کرو، ہنسی اڑاؤ مگر ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے مسائل کا حل سماج کے احکام کی تعمیل میں نہیں ہے بلکہ بےدین سماج کو دیندار سماج بنادینے میں ہے۔

بقرعید عید سے ہلکی ہوتی ہے نئے کے بجائے دُھلے کپڑوں میں کام چل جاتا ہے۔البتہ بقرعید کے بعد ہی پورے سماج پر ''محرم آرہا ہے'' کی بےچینی چھا جاتی ہے۔ کسی کو امامباڑہ کی پُتائی کی فکر ہے، کسی کو پرانے پنجے اور پٹکے بدلوانے کی فکر ہے۔کوئی ضریح کے لئے پریشان ہے کوئی سر پکڑے بیٹھا ہے کہ خاندانی عزاداری کا خرچ کیسے پورا کیا جائے کوئی سالانہ مجلس کے لئے فکرمند ہے۔کسی کو شب بیداری کی فکر ہے۔کسی کو

سبیل کی فکر ہے کسی کو ۸/محرم کی نذر کی فکر ہے۔کسی کو اپنی انجمن کی فکر ہے۔کسی کو اپنے ذاکر کی فکر ہے اور ذاکروں کو اپنے عشروں کی فکر ہے۔محرم میں حلوائی سے لے کر ذاکروں تک سب کو کمانے کی فکر ہوتی ہے اور امیر عزاداروں سے لے کر غریب عزاداروں تک سب کو خرچ کی فکر ہے وہ فکرمند ہیں۔کمانے میں کمی نہ رہ جائے۔ یہ فکرمند ہیں کہ خرچ میں ایسی کوئی کمی نہ رہ جائے کہ عورتوں کو شک آجائے یا سماج انگلی اٹھائے۔

مگر جس کے دم سے محرم ہے اس حسینؑ کے مقصد شہادت کی کسی کو فکر نہیں ہے۔ ورنہ ہم صرف عزادار یا ذاکر نہ ہوتے بلکہ خود بھی دیندار ہوتے اور محرم میں دیندار بنانے کی مہم بھی چلاتے۔کل حسینؑ شہید ہوئے تھے مگر دشمنوں کے ہاتھوں۔آج مقصد حسینؑ شہید ہو رہا ہے عزاداروں کے ہاتھوں یعنی محرم آرہا ہے اور حسینؑ جارہے ہیں۔ ہے کوئی جو حسینؑ سے رکنے کی درخواست کرے۔

دماغ کا سوئچ آن رکھئے

نظر دیکھنے پر اور دماغ سوچنے پر مجبور ہے۔اسلام نے دونوں باتوں کی دعوت دی ہے۔قرآن مجید میں یہ حکم بھی موجود ہے کہ دنیا میں گھومو۔زمین کے چکر لگاؤ۔سفر کرو چلو پھرو تا کہ نظر کو دیکھنے کا سامان ملے،اور اس بات کی بھی شدید تاکید ہے کہ اپنی ذات سے لے کر کائنات کی ہر سرحد تک جو دیکھو اس پر غور کرو البتہ نظر ہو یا فکر۔آنکھ ہو یا دماغ دونوں کو پابند کیا گیا ہے نہ برائی دیکھو،نہ سنو،نہ سوچو۔

مولائے کائنات حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کچھ ہمراہیوں کے ساتھ اس جگہ سے گذرے جہاں غلاظت ڈھیر تھی۔آپ نے فرمایا شوقین لوگ جن چیزوں پر بڑھ چڑھ کر ہاتھ مار رہے تھے یہ وہی چیزیں ہیں ان کا آخری انجام دیکھو۔اگر یہ انجام یاد رہے تو آغاز میں بھی ہاتھ مارنے کے بجائے انسان کنارہ کش ہونے کو بہتر قرار دے۔

اسی طرح مولاؑ نے ایک بار فرمایا کہ آدمی کس بات پر گھمنڈ کرتا ہے ابتدا میں ایک نجس قطرہ ہوتا ہے۔انتہا میں نجس مردہ ہوتا ہے اور ساری زندگی نجاستوں اور غلاظتوں کو اپنے اندر بھرے پھرتا ہے اپنے انجام و آغاز کو دیکھ کر آدمی کو اپنے حقیر ہونے کا احساس ہونا چاہئے نہ کہ غرور کا۔

مولیٰ نے انداز فکر کی جو رہبری فرمائی ہے اسکے نمونہ آپ نے ابھی پڑھے۔اسی انداز فکر کی قیادت میں چند مناظر اور کچھ سین ہماری نظروں سے بھی گذرے

اور ہم بھی سوچنے پر مجبور ہوئے۔جی چاہا کہ جو نظر نے دیکھا آپ کو بھی اس کا نظارہ کرادیں اور جو دماغ نے سوچا آپ کو بھی اپنی سوچ میں شریک کرلیں۔شاید کبھی آپ بھی ہم کو اپنی دعاؤں میں شریک کرلیں۔

میرا رخ پورب کی طرف تھا۔داہنے ہاتھ پر وسیع وعریض شاہی مسجد تھی الٰہی مسجد نہ تھی لہٰذا سیاح تو دیکھنے آتے ہیں مگر نمازی نہیں آتے تھے اور اگر کوئی آیا بھی تو اونٹ کے منھ میں زیرہ کہاں دکھائی دیتا ہے۔بائیں ہاتھ پر ایک گندہ نالہ بہہ رہا تھا جو معلوم نہیں کب سے بہہ رہا تھا اور کہاں کہاں سے اور کیسی کیسی اور کس کس کی گندگیاں جمع کرتا ہوا بہہ رہا تھا میرے سامنے کی طرف سے کھلے میدان میں صاف ستھرے۔اسکولی ڈریس میں آراستہ وپیراستہ، چاق وچوبند۔ ہنستے کھیلتے مگر اپنی تعلیم وترقی کے لئے فکر مند لڑکوں اور لڑکیوں کے گروپ گذر رہے تھے۔اسی وقت میری نظر اس چھوٹے سے پل پر پڑی جو گندے نالے پر بنا تھا۔ایک شخص ایک لڑکے کو مارتا ہوا پل کے ذریعہ نالہ کے اس پار لے جارہا تھا۔مار جاری تھی کوئی بچانے والا نہ تھا۔میں چلتے چلتے رک گیا کیونکہ یہ سوچ کر میری سانس رک گئی تھی کہ اسی طرح کل میدان محشر میں جب پابند دین افراد اپنے صاف ستھرے اعمال کے ساتھ جنت کی طرف ہنسی خوشی جارہے ہوں گے تو دین سے جاہل اور غافل رہنے والوں کو ملائکہ مارتے ہوئے دوزخ کی طرف لے جارہے ہوں اور اس دن نہ کوئی بچانے والا ہوگا اور نہ بولنے والا ہوگا۔میں نے ایک بار پھر نظر بھر کر اسکول جانے والے گروپوں کو دیکھا اور یہ طے کر کے زندگی کی ڈگر پر چل پڑا کہ چاہے جو ہوجائے مگر دین کو پڑھیں گے اور پڑھائیں گے۔دیندار بنیں گے اور دیندار بنائیں گے اور اللہ نے چاہا تو جنت جائیں گے اور جنت میں لے جائیں گے۔میں چلتا رہا میری نظر اگرچہ دنیا

میں گردش کررہی تھی مگر میرا دماغ دنیا کے اس پار آخرت کو دیکھ رہا تھا۔

سفر جاری تھا۔ قدم، نظر، دماغ سب اپنے اپنے سفر میں مصروف تھے کہ ایک لمبی چڑھائی آ گئی۔ جتنا بڑھتے گئے سانس بھی بڑھتی گئی۔ ابھی آدھی چڑھائی یعنی مشکل چڑھائی باقی تھی پلٹ کر دیکھا تو کچھ لوگ ہم سے بھی پیچھے رہ گئے تھے اور سامنے دیکھا تو کچھ ہم سے بھی آگے نکل گئے تھے حالانکہ سب ایک ساتھ چلے تھے۔ وجہ صاف تھی جو ہلکے پھلکے تھے اور جن کا سامان کم تھا وہ آگے تھے اور جو بھاری بھرکم تھے اور سامان بھی بوجھل لادے تھے وہ پیچھے تھے۔ آج تو میدان محشر دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ سوچنے لگے کل یہی حال قیامت کے دن بھی ہوگا۔ قناعت کرنے والے اور ہلکی پھلکی خواہشات رکھنے والے آگے نکل جائیں گے اللہ کے حضور میں حاضر ہو جائیں گے پروانہ پائیں گے اور جنت میں پاؤں پساریں گے۔ اور اوڑھنا بچھونا بس لالچ، خواہش، تمنا، آرزو تھی دنیا کی یہ بھاری بھرکم ہستیاں گناہوں کا بے حساب بوجھ لادے ہوں گی ان کا اٹھنا اور کھڑا ہونا مشکل ہوگا چلنا تو بڑی بات ہے یہ جانہ سکیں گے بلکہ لے جائے جائیں گے خدا کے سامنے پیش ہوں گے مگر دنیا کے کثیر حلال کا دیر تک حساب دیں گے اور دنیا کے حرام کے ڈھیروں کے عذاب ان کے سامنے ہوں گے جن میں جھونک دیئے جائیں گے۔ یہ سوچ کر میں اس طرح لرزا کہ میرا وجود لرز گیا اور طے کیا کہ سمجھیں گے اور سمجھائیں گے اور قناعت کو اپنائیں گے ورنہ.....

چڑھائی طے ہونے کے قریب تھی کہ ایک آدمی کو دیکھا جوتا ہاتھ میں لئے ہے اور ننگے پیر چل رہا ہے۔ موسم کی شدت نے پیروں کا برا حال کر دیا ہے۔ لنگڑا نہیں ہے مگر لنگڑا رہا ہے۔ چل رہا ہے مگر اچھلتا دکھائی دے رہا ہے، قدم رکھتا ہے مگر قدم ٹکتا نہیں

ہے۔ ہم سے اس کا حال زار دیکھا نہ گیا۔ لپکے، قریب پہنچے کہا بھائی جوتا موجود ہے اور تم پیروں کا بھُرتا بنا رہے ہو۔ بولے۔ دوکان پر سجا تھا۔ اسے دیکھا اور دیکھتے ہی جی لوٹ پوٹ ہو گیا زیادہ قیمت دی۔ خوشامد الگ کی۔ اس نے دام بھی لئے۔ احسان بھی رکھا۔ ہم خوشی خوشی گھر لے آئے۔ آج پہن کر نکلے کہ اپنی شان خود بھی دیکھیں گے اور دوسروں کو بھی دکھائیں گے۔ دل کو یہی یقین تھا کہ ہر قدم شاندار ہوگا۔ اشتہار میں بھی یہی پڑھا تھا مگر تھوڑی دور چلے تھے کہ چھالے پڑ گئے پہن تو لیا تھا مگر اتارنا مشکل ہو گیا۔ پہننے میں انگلی بچی ہوئی تھی۔ اتارنے میں پیر زخمی ہو گیا۔ گوشت سے ناخن جدا ہو گیا۔ اب نہ پہن سکتے ہیں۔ پھینک سکتے ہیں جس حال میں ہیں تم خود دیکھ رہے ہو۔ حد ہے کہ اجنبی ہو مگر ہمارے لئے رو رہے ہو۔ جوڑا بڑا خوبصورت تھا مگر بے جوڑ نکلا۔ وہ آپ بیتی سنا کر پھر چل پڑا اور مجھے اپنے پڑوسی یاد آئے جو خوبصورتی، جہیز، بڑا گھر دیکھ کر شادی کر بیٹھے تھے۔ ان کی زندگی اور اس آدمی کی بپتا میں کوئی فرق نہ تھا۔ اگر اس نے جوتے اور پیر دونوں کو دیکھ لیا ہوتا تو آرام سے چلتا۔ انہوں نے بھی اگر دینداری کی بنیاد پر شادی کی ہوتی تو خوف خدا دونوں کو ہر تکلیف واذیت سے محفوظ رکھتا۔

میرا دماغ ابھی ہچکولے کھا رہا تھا کہ کان میں ایک چیخ سنائی دی ''ہائے مر گئے'' پلٹ کر دیکھا تو ایک صاحب اپنا سر معہ ناک کے پکڑے بیٹھے تھے اور دوسرا اپنے جوتے زمین سے اٹھا کر پھر اپنی لاٹھی میں لٹکا کر اور لاٹھی کندھے پر رکھ کر روانہ ہونے والا تھا۔ پہلے ہم ہائے مر گئے کی طرف متوجہ ہوئے کہ آپ زندگی میں کیوں مر گئے۔ انہوں نے کہا یہ دیہاتی اپنی لاٹھی اس کندھے سے اس کندھے پر رکھ رہا تھا کہ لاٹھی نے پوری قوت سے میرے سر پر سے سفر کیا۔ مزید برآں یہ کہ اس کے نعل دار وزنی جوتوں نے عینک اور ناک

دونوں کو توڑ دیا۔ سر کی چوٹ عینک کا نقصان تو برداشت کرسکتا ہے مگر ناک کی چوٹ کون برداشت کرسکتا ہے لہٰذا ہم تو زندگی ہی میں مر گئے۔

ہم دیہاتی کی طرف لپکے کہ گاؤں کی لاٹھی کا شہر کی گنجان آبادی میں کیا کام ہے پھر جو ہاتھ میں رہنے والی چیز ہے اس کا کندھے پر کیا کام پھر لاٹھی بھی کوئی پنسل یا جنازہ ہے کہ کاندھا بدلا جائے۔ اس نے ہم کو گھور کر دیکھا اور ہم کو عالم تصور میں لاٹھی اپنے سر پر سے سفر کرتی ہوئی محسوس ہوئی پھر بھی ہم نے پوچھ لیا کہ اور یہ بھی بتاؤ کہ جوتے پہننے کے لیے ہوتے ہیں کہ لٹکانے کے لئے اس نے بار دیگر گھورا اور گرجا قانون رکھو تم اپنے شہر میں۔ ہم آزاد لوگ ہیں چاہے کسی کا سر پھوٹے یا ناک ٹوٹے۔ ہم اس کی سن رہے تھے اور خود سوچ رہے تھے کہ اگر یہ آزادی ہے تو پھر آوارگی اور درندگی کیا ہوگی کہ اس نے جوتا لٹکانے کا فلسفہ بھی بیان کیا کہ یہ جوتے دادا کے ہیں اور ہمارا پوتا پہنے گا۔ مالک نے پیر دیئے اور دادا نے جوتے اور یہ کہہ کر دیئے کہ چمڑی جائے تو جائے مگر دمڑی نہ جائے اور واقعی چمڑی جا چکی تھی۔ اسی سڑک پر ایک کے پیروں کا بھرتہ بن گیا تھا اور دوسرے کی کھال مردہ ہو چکی تھی۔ اس نے پھر تیسری مرتبہ دیکھا۔ اس مرتبہ اس کی نگاہ کہہ رہی تھی کہ جاتے ہو کہ دوں ہاتھ اور فوراً ہماری سمجھ میں دے ہاتھ کے معنی سمجھ میں آ گئے۔

اسی طرح سوچ بچار میں سفر طے ہو گیا ہمارے ایک امیر عزیز ہوائی جہاز سے آئے تھے۔ ہم ان سے ملنے آئے تھے مگر ان کو دیکھ سکے نہ مل سکے کیونکہ وہ بری طرح سردی میں جکڑے تھے اور ایک پل کے لئے بھی ان کی کھانسی نہیں رکتی تھی۔ ہر کھانسی پر کلیجہ پکڑ لیتے تھے۔ سب کھڑے تھے اور یہ پڑے تھے سب دیکھ سکتے تھے مگر کوئی مل نہیں

سکتا تھا۔ حال پوچھا معلوم ہوا ایک بریف کیس لئے ہوئے کناڈا سے چلے ہوائی جہاز میں اڑے۔ مزے اڑاتے دہلی آ گئے۔ وہاں سے ٹرین سے چلے۔ برفباری ہو چکی تھی۔ بریف کیس میں لاکھوں تھے مگر کام نہ آئے۔ ہم دیدار کرکے پلٹے۔ مگر ہمارا دماغ وہیں رہ گیا بلکہ ایک چھلانگ میں پھر آخرت پہنچ گیا کہ جو دولت والے بغیر پکے ایمان اور سچے اور اچھے اعمال کے محشر پہنچیں گے وہ اسی طرح تڑپیں گے اور کوئی کام نہ آئے گا۔

آخرت کے بار بار تصور نے حافظہ کا ڈھکنا اٹھا دیا تھا اور اپنے کئے ہوئے بے شمار گناہ یاد آ رہے تھے۔ ہم جہاں سے آئے تھے وہاں واپس جا رہے تھے مگر گناہوں کی سیریز کو حافظہ اگل رہا تھا اور ہمارے ہاتھ پیروں کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ ہم میں واپس جانے کی طاقت بھی نہ تھی۔ اسی عالم مجبوری میں دیکھا کہ ایک شریر بچے کو اس کی ماں مار رہی تھی۔ بچہ تڑپتا تھا روتا تھا مگر ماں ہی سے لپٹ جاتا تھا۔ آخر ماں نے کلیجہ سے لگا لیا بچے کے آنسو پوچھے اور کہا آئندہ شرارت نہ کرنا۔ بچہ ماں کے کلیجے سے لگا تھا مگر اب اس کا دل دھک دھک نہیں کر رہا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر خیال آیا کہ جب ماں اتنی رحم دل ہوتی ہے تو رحمٰن و رحیم خالق اور کریم مالک کتنا مہربان ہوگا مگر پھر بھی بری طرح ڈرے مگر خدا سے روئے مگر خدا کے سامنے اور خدا ہی کے نام پر چودہ معصوموں کو مدد کے لئے پکارا کہ ہماری توبہ قبول کرا دیں۔ بس توبہ کا تصور آتے ہی دل کی دھک دھک ختم ہو گئی اور ہم تیزی سے جہاں سے آئے تھے وہاں دوبارہ حاضر ہونے کے لئے روانہ ہو گئے۔

آیئے خواب دیکھیں مگر........

خواب ہم روز دیکھتے ہیں۔مگر خواب کی حقیقت ہم کو نہیں معلوم۔اپنی ہی حقیقت سے بے خبر ہونے کے بعد بھی ہمارا اپنے بارے میں یہی خیال ہے کہ ہم سے زیادہ باخبر پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ دومنزلہ جہالت ہے جس کو علماء لوگ جہل مرکب کہتے ہیں۔خیر۔

ہم خواب روز دیکھتے ہیں مگر ہمارے اکثر خواب جھوٹے ہوتے ہیں جو ہمارے معدہ کی پیداوار ہوتے ہیں۔معدہ ٹھیک ہوتا ہے تو اچھے اچھے خواب نظر آتے ہیں اور معدہ چوپٹ ہوتا ہے تو ڈراؤنے خواب ہم کو کئی کئی دن تک چوپٹ رکھتے ہیں ڈراؤنے خواب کے ڈر کو باقی رکھنا بھی چوپٹ معدہ کا کام ہوتا ہے چوپٹ معدہ اپنے کو خود جتنا چوپٹ رکھتا ہے۔اپنی اس ڈیوٹی (ڈر باقی رکھنے میں) اتنا ہی چوکس رہتا ہے۔اور اس کی چوکسی ہم کو خواب کی تعبیر پوچھنے پر مجبور کرتی ہے۔ملا جی،مولوی صاحب عامل صاحب، پنڈت جی کے پاس ہم کو ہمارا یہ معدہ لے جاتا ہے۔ان کو اپنے خوابوں کی تعبیر نہیں معلوم تو وہ ہمارے خواب کی تعبیر کیا بتلائیں گے۔مگر معدہ کی بھی ایک برادری ہے اور برادری کا خیال برادری والا نہ کرے گا تو کون کرے گا۔

ملا، مولوی، عامل، پنڈت سب کے معدے خالی پڑے تھے۔ ہمارا چوپٹ معدہ ہم کو ان کے پاس لے گیا۔انہوں نے علم یا عقل کے مطابق نہیں کیونکہ علم و عقل ان

کے پاس ہوتے ہی کب ہیں البتہ اپنے خالی معدوں کے مطابق تعبیر بتلا دی۔خواب نے تو چوپٹ کیا ہی تھا کہ ہم بوکھلائے ہوئے بلکہ بولائے ہوئے تعبیر پوچھتے پھر رہے تھے۔ تعبیر نے اور بھی چوپٹ کیا۔عقل تو ماری ہی گئی تھی۔دولت بھی ماری گئی۔کسی کو پیسہ دیا، کسی کو مرغا دیا۔کسی کو لوبان اور زعفران دیا۔کسی کو گپت رقم دی تاکہ جو بلا آنے والی ہے وہ دفع ہو جائے۔غرضکہ ہمارے چوپٹ معدہ نے اپنی برادری کی مدد کی۔خالی معدے بھر گئے بلکہ اتنے بھرے کہ وہ بھی چوپٹ ہو گئے۔اور برادری تب مکمل ہوئی جب ملا۔ مولوی، عامل، پنڈت کو بھی ڈراؤنے خواب نظر آنے لگے۔یہ ہے خوابوں کا چکر۔یہ چکر صرف اردو کا چکر نہیں ہے کہ سر چکرانے پر ختم ہو جائے بلکہ علماء لوگ اسے دور کہتے ہیں۔ اور ایجوکیٹیڈ لوگ اسے سرکل کہتے ہیں۔غرضکہ خوابوں کا یہ دور تسلسل کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔حتیٰ کہ تعبیر کے نام پر لوٹنے والے ملا،مولوی، عامل، پنڈت کو خواب میں تعبیر پوچھنے والے ان کا گلا گھونٹتے دکھائی دیتے ہیں۔

البتہ کوئی کوئی خواب سچا بھی ہوتا ہے۔مگر ہم جب خواب دیکھتے ہیں تو اس وقت ہم کو اس کی سچائی کا علم نہیں ہوتا اور جب وہ سچا ثابت ہوتا ہے تو ہم کچھ کرنے سے مجبور ہوتے ہیں۔ یہ ہے خوابوں کی وہ مجبوری۔جس کو اگر ہم اپنی گرہ میں باندھ لیں تو پہلے اپنے معدے کی اصلاح کریں پھر دماغ کی اصلاح کریں کہ خواب دیکھیں اور خواب کو سر سے جھٹک دیں اور اپنے کاموں میں مصروف ہو جائیں۔لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ صبح کی نماز کے وقت خواب دیکھا ہے۔لہٰذا ضرور سچا ہوگا مگر خواب تو سچا نہ ہوگا البتہ یہ بات ضرور سچی ہو جائے گی کہ ہم نماز کے وقت بھی نماز صبح پڑھنے کے بجائے خواب ہی دیکھتے ہیں۔ کیونکہ دین ایک خواب ہے جو ہم نے ماں کی گود میں دیکھا تھا۔دین کی باتیں ہمیں

بھولی بھولی، خواب کی طرح یاد آجاتی ہیں۔لیکن دین ہمارے خیال میں نہیں ہے۔اور ہمارا خیال اتنا بڑا بھی نہیں ہے کہ اس میں دین اور دنیا دونوں کو جگہ مل سکے۔دنیا کی اس مختصر زندگی میں ہم دین کا خیال بھلا کہاں کر سکتے ہیں۔البتہ قبر میں ہزاروں سال ہونا ہوگا دین کے خواب وہاں دیکھ لیں گے مگر سنا ہے کہ جو دنیا میں دین کا خیال نہیں کرتا ہے۔ ملائکہ اسے قبر میں پہلے ہی دن گرز مار کر قیامت تک کے لئے اس کی قبر کو آگ سے بھر دیتے ہیں پھر قیامت کے دن قبر نکال کر دوزخ میں ٹھونس دیتے ہیں لہٰذا اچھا تو یہی ہے بلکہ ضروری ہے بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ قبر میں چین سے سونے کے لئے اور جنت میں ایڈمیشن ملنے کے لئے دنیا میں پہلے دین کا خیال کریں۔تو خدا ہماری دنیا کا بھی خیال کرے گا اور دین کا بھی۔مگر بس بات دل کو قابو میں رکھنے کی ہے۔ اور یہ کام کچھ مشکل بھی نہیں۔البتہ اپنے کو دل کے ہاتھوں میں دینے کے بجائے دل کو ہاتھ میں لینا ہوگا۔مگر ہماری عادت تو دوسروں کے دلوں کو توڑنے کی پڑ گئی ہے دلوں کو ہاتھوں میں لینا تو ہم نے سیکھا ہی نہیں ہے۔

خیر۔بات خواب کی چل رہی تھی۔بعض لوگوں کو خوابوں میں بشارتیں ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ یہ ہدایت بھی ہوتی ہے کہ ایک درجن خطوط میں یہ بشارت لوگوں کو لکھ کر بھیجو ورنہ آفت میں پھنسو گے اور جسے لکھوا سے بھی ایک درجن خطوط میں بشارت لکھنا لازم ہے ورنہ وہ بھی آفت میں پھنسے گا شیطان بھی کیا کیا چکر چلاتا ہے۔قرآن وحدیث لاکھ بیان ہو کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، اطاعت والدین وغیرہ واجبات نہ ادا کرو گے یا جھوٹ، غیبت، جوا، شراب، ظلم، لوٹ کھسوٹ وغیرہ حرام کام کرو گے تو ضرور آفت میں پھنسو گے جس سے چھٹکارا ملنے والا نہیں ہے مگر ہم اسلام کے اقرار کے آگے عمل اور

احکام کی پابندی میں پھنسنے پر تیار نہیں ہیں۔لیکن بشارت کے جھوٹے، فرضی خطوط کے شیطانی چکر سے ہم اپنے کو نہیں نکال سکتے۔سب کو شک آتا ہے کہیں کوئی آفت نہ آجائے عورتوں کو زیادہ، ان سے زیادہ مالداروں کو، ان سے زیادہ ظالم رشوت خور افسروں کو شک آتا ہے لہٰذا خطوط لکھے جائیں گے، لکھوائے جائیں گے۔سائکلو اسٹائل ہوں گے فوٹو اسٹیٹ کاپیاں نکلوائی جائیں گی۔پھر پتے ڈھونڈھے جائیں، ملک میں نہیں ملیں گے تو فاران کے پتوں پر بشارتی خطوط روانہ ہوں گے۔ہم مشہور آدمی ہیں لہٰذا فرضی بشارتی خطوط سے ہماری ردی کی ٹوکری خالی نہیں رہتی۔اور ردی کی ٹوکری کے پاس شیطان بیٹھا منھ بسورتا رہتا ہے اور ہم خدا کے فضل سے ہنستے رہتے ہیں اور اللہ نے چاہا تو ہمارا یہ مضمون شیطان کو موٹے موٹے آنسوؤں سے رلائے گا مگر وہ بڑا شیطان ہے اور کوئی طریقہ ایجاد کر لے گا۔فرضی بشارتیں، فرضی کہانیاں، فرضی معجزہ سب اسی ملعون کے ہتھکنڈے ہیں۔جن سے صرف معرفت وایمان ویقین والے محفوظ رہتے ہیں کیونکہ ان کو شک نہیں آتا باقی سب پھنس جاتے ہیں۔

مقدس خواب والوں کی ایک قسم زیارت والوں کی ہے کسی کو نبیؐ کی زیارت ہوتی ہے کسی کو امامؑ کی زیارت ہوتی ہے۔کسی کو معصومہؑ اور کسی کو شہداءؑ کی زیارت ہوتی ہے۔یہ لوگ بذریعہ بیان اپنے خواب کی زیارت دوسروں کو کراتے ہیں اور جس کے چہرہ پر ان کو زیارت کی بشارت کے بجائے سناٹا دکھائی دیتا ہے۔ان کو اس کے ایمان، اسلام بلکہ حلالی ہونے میں شک ہو جاتا ہے۔اور اگر یہ اعلان ہو گیا کہ جسے شک ہو وہ مسلمان اور مومن نہیں ہے تو شک والے اپنے شک کا اظہار کر دیں گے لیکن اگر یہ اعلان ہوا کہ صرف حلالی ہی کو یقین آتا ہے تو ہر شخص اپنی ماں کی عزت کی خاطر اقرار کر لیتا ہے۔

اب تک ان خوابوں کا ذکر تھا جو ہم سوتے میں دیکھتے ہیں۔ اب ان خوابوں کا بھی ذرا چرچا ہوجائے جو ہم جاگتے میں دیکھتے ہیں۔ بغیر پڑھے پاس ہوجانے کا خواب۔ بغیر کمائے دولت مند ہوجانے کا خواب۔ یہ لاٹری اور معمہ کے ذریعہ بہت دیکھے جاتے ہیں۔ پہلے لاٹری کے خواب ماہوار آتے تھے اب ہر ہفتہ بلکہ روزانہ آنے لگے ہیں۔ بغیر آمدنی سے قرض لینا اور ادا ہوجانے کا خواب بھی دیکھا جاتا ہے۔ الیکشن جیتنے کا خواب ان کو بھی دکھائی دیتا ہے جن کو کوئی نہیں جانتا۔ بعض لوگوں کو شادی، شاعری، ذاکری، مصنف ہونے کے بھی خواب دکھائی دیتے ہیں جن کی تعبیر ہمیشہ الٹی ہوتی ہے۔ اب الٹی تعبیریں سنئے۔

لڑکے فیل ہوتے ہیں۔ گھر اور کالج سے نکالے جاتے ہیں اور سڑک چھاپ زندگی بسر کرتے ہیں۔ دین، دنیا دونوں برباد ہوجاتی ہے لاٹری نہیں نکلتی ہے ایک دن فٹ پاتھ پر مرتے ہیں اور چندہ سے کفن دیا جاتا ہے۔ قرض ادا نہیں ہوتا ہے جائداد مع عزت کے نیلام ہوتی ہے سر چھپانے کی جگہ نہیں رہ جاتی۔ مگر سب سے منھ چھپاتے پھرتے ہیں۔ الیکشن میں ضمانت ضبط ہوتی ہے۔ شادی کے نام پر بے وقوف بنائے جاتے ہیں۔ شاعری کے ذریعہ بے عزتی کراتے ہیں۔ ذاکری میں ہوٹنگ نصیب ہوتی ہے۔ تصنیف کے شوقین صرف اپنی ناکارہ زندگی کے منصف بنتے ہیں۔ ان سے گھر والے عاجز رہتے ہیں مگر وہ کاغذ گودا کرتے ہیں۔ آخر میں ملک الموت کاغذات لے کر آجاتے ہیں اور نامہ عمل کی شکل میں ان کی زندگی تصنیف ان کے ہاتھوں میں دی جاتی ہے۔

اگر ہم ایسے سارے خوابوں کو دیکھنے والوں کو محروم، بدنصیب، کام چور قرار

دیتے ہیں تو ایک خواب ایسا ہے جو ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ نہ دین جانیں گے، نہ دین پڑھیں گے، نہ دین کی باتیں پوچھیں گے۔ بلکہ جو سن لیں گے اسے یا جھٹلائیں گے ورنہ کم از کم عمل نہ کریں گے بلکہ ہر واجب چھوڑ دیں گے اور ہر حرام کرتے رہیں گے اور خواب دیکھیں کہ جنت مل جائے گی۔ قبر بھی جنت کا باغ بن جائے گی مگر جب تعبیر الٹی ہوگی تو کیا ہوگا۔ اگر یہ بات ہم سوچ لیں تو جنت کا خواب دیکھنے کے بجائے جنتی زندگی دین کے سایہ میں بسر کرنا شروع کریں۔

بہترین موت

عموماً بگڑی فطرت رکھنے والے انسانوں کا مشغلہ ہوتا ہے دوستوں میں، عزیزوں میں لڑائی کرادینا۔ان کو لڑائی کرانے میں، لڑائی دیکھنے میں مزا آتا ہے جن کے پاس پیسے زیادہ ہوتے ہیں وہ لڑائی کے ذوق کی تسکین کے بڑے بڑے سامان کرتے ہیں، میچ، دنگل، باکسنگ انسانوں میں لڑائی کے فنکشن ہیں، مرغ لڑانا، بٹیر لڑانا، اور دوسرے جانوروں کی لڑائی کا انتظام کرنا ان کو لڑنے کی تربیت دینا، سب اسی ''جنگی ذوق'' کا نتیجہ ہیں۔ یہ ذوق سیاست وتجارت میں الیکشن اور کمپٹیشن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

آج ہر ملک اپنی دولت کا نصف سے زیادہ حصہ دفاع کے نام پر فوج تیار اور لڑائی کے سائنس پر اور جنگی تحقیقات پر صرف کررہا ہے جب سماج کا ذوق لڑائی ہے تو غریب دین اس کی زد سے کیونکر محفوظ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ کچھ دیندار، خدا اور رسولؐ میں لڑائی کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ان کے خیال میں اگر رسولؐ کو علم غیب مل گیا۔ اعجازی طاقت مل گئی۔ نبیؐ کو قابل تعظیم واحترام کا مستحق مان لیا گیا تو ان غریب اللہ والوں کے بیچارہ خدا کے پاس کچھ رہ نہیں جائے گا۔ خام خیالی کے ان مریضوں کو کون بتائے کہ خدا نے دنیا میں سب کچھ بھر دیا پھر ساری دنیا کا اقتدار انسان کو دیا۔ اور انسانوں سے زیادہ اقتدار، توانائی نبیوں کو دی۔ جو کچھ سارے نبیوں کو دیا تھا۔ اس کا لاکھوں گنا کمال حضورؐ کو

دیا مگر اس کے بعد بھی اس کی خدائی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔لیکن مسلمان میں خدا اور رسول کے نام پر لڑائی ہوگئی۔ جماعت بندی ہوگئی۔ اللہ والے، رسول والے الگ پارٹیوں کے نام پڑ گئے۔ مسجدیں تقسیم ہوگئیں اور اس تقسیم کے لئے مسجدوں میں جہاد ہوگئے اور قاتل ومقتول دونوں بہ آسانی دوزخ میں پہنچ گئے۔

جو لوگ اس لڑائی میں حصہ نہ لے سکے انہوں نے لڑائی کا دوسرا میدان تیار کرلیا۔ ایک طرف خدا والے، رسولؐ والے جمع ہوگئے اور دوسری طرف اہلبیتؑ پیغمبرؐ والے جمع ہوگئے مگر ان بیچاروں کو خبر نہیں ہوئی کہ خدا اور رسولؐ اور اہلبیتؑ سب متحد ہیں ایک حاکم ہے دوسرا حاکم کا نمائندہ ہے تیسرے نمائندے کے نمائندے ہیں۔ جو ان کے نام پر لڑنے والوں سے اظہار نفرت وبرائت کررہے ہیں اور یہ طے ہے کہ جو ان کی نفرت کا مستحق بن گیا اس کو صرف جہنم ہی اپنی آغوش میں لے سکتا ہے۔مختصر یہ کہ دین کے نام دین کے ماننے والوں میں بہت سی مہمل، مضر اور فاسق لڑائیاں جاری ہیں۔ مثلاً عبادت خدا اور محبت اہلبیتؑ میں کون افضل ہے۔ اہلبیتؑ اور قرآن مجید میں کون افضل ہے۔ حضورؐ اور بارہ امام علیہم السلام کو بالکل برابر رکھا جائے یا حضور کو ان اماموں کا نبیؐ مان کر ان اماموں کے لئے قابل تعظیم مان لیا جائے۔ زکوٰۃ وخمس میں کون زیادہ اہمیت رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ حالانکہ خدا نے محبت اہلبیتؑ کو عبادت قرار دیا ہے اور ایسی عبادت قرار دی جس کے بغیر ہر عبادت رد ہے اور اہلبیتؑ نے انسانوں کو عبادت خدا کا پابند بنانے کے لئے اپنی جانیں قربان کردیں۔ قرآن آج تک حقوق اہلبیتؑ کی حفاظت کررہا ہے اور کل قرآن کو بچانے کے لئے اہلبیتؑ کے سروں نے نوک نیزہ پر بلند ہونا اپنا فریضہ قرار دے لیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا ہم سب محمد ہیں۔ ہم سب چھوٹے اور بڑے کمالات میں یکساں

ہیں اور سردار اہلبیتؑ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے تھے میں محمدؐ کے غلاموں میں سے
ایک غلام ہوں۔ اگر کسی مال میں زکوٰۃ اور خمس دونوں واجب ہو جائیں تو کسی ایک کا نکالنا
کافی نہ ہوگا بلکہ دونوں کی ادائیگی کے بعد ہی مال پاک ہوگا اور مال کا مالک اس مال کو
خرچ کرنے کا حق دار ہوگا معلوم ہوا دین اور اس کے تمام اجزا متحد ہیں اور ہم بے وقوف
دین کے اجزا کو ایک دوسرے کے مقابل لا کر اور بڑی قیمت دے کر دوزخ خرید رہے
ہیں۔

غرضکہ بے بنیاد، نام نہاد اور فرضی لڑائیاں، افراد میں، خاندانوں میں،
عزیزوں میں، دوستوں میں، اداروں میں، جماعتوں میں جاری ہیں، سمجھدار کا فرض ہے
کہ ان لڑائیوں سے دور رہے بلکہ ان لڑائیوں کو دور کرے اور ان کو ختم کرے۔ یہ مضمون
اسی سلسلہ کی ایک کوشش ہے۔

کچھ لوگ دین اور دنیا میں لڑائی کرانے کے لئے اپنی ساری ذہنی توانائی کو برباد
کر رہے ہیں۔ ایک طرف وہ دانشور ہیں جو دین کو افیون کا نام دیتے ہیں۔ عہد جاہلیت
کی یادگار قرار دیتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی دین قرار دیتے ہیں۔ عہد حاضر میں دین
کی کوئی ضرورت نہیں ہے دین ترقی سے روکتا ہے۔ دین مٹ جائے تو انسان ایک
ہو جائیں وغیرہ قسم کے نعرہ دے کر دین کو دنیا کے اس پار پھینک دینا چاہتے ہیں۔

دوسری طرف وہ دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے ہیں جن کی عقل سکڑ گئی ہے۔
جو جہالت کو علم، ضد کو وضعداری سمجھ بیٹھے ہیں اور ان کے ساتھ وہ فنکار ہیں جو اپنی عیاری
کے ذریعہ دین کے نام پر دنیا کمانا چاہتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں کی لڑائی کے میدان
دین اور دنیا میں دونوں کا خیال ہے کہ دنیا اور دین جمع نہیں ہو سکتے۔ ایک دنیا کے لئے

دین کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔ دوسرے دین کے کام دنیا چھوڑنا چاہتے ہیں۔ نیک دل گوتم
بدھ اسی غلط فہمی کا شکار ہوئے۔

راہبوں نے، پادریوں نے، ننوں نے، فقیروں نے، پیروں نے، شاہ
صاحبان نے، صوفیوں نے، سادھوؤں نے بھی اسی راستے کو اپنایا مگر پیر کا دنیا چھوڑ دینا،
مگر مرید کا دنیا کما کر پیر کو نذرانہ پیش کرنا، سادھو کی سیوا کے ذریعہ پاپ والے کا پُن والا
ہو جانا، گرجوں کے تہہ خانوں میں کنوارے پادریوں اور کنواری ننوں کی ناجائز اولاد کی
چھوٹی چھوٹی قبریں، شاہ صاحبان اور عاملوں اور ملاؤں کی عیاشیاں، سادھوؤں کا سونا
دونا کرنے کا فریبی کاروبار وغیرہ اس نظریہ کا کھوکھلا پن اور مکروہ کردار واضح کر رہے
ہیں۔

مسلمانوں میں حکومت میں حصہ نہ پانے والے ہوس اقتدار کے متوالوں نے
امام محمد باقرؑ کے زمانہ میں صوفی ازم کی بنیاد رکھی۔ تاکہ حکومت زمین پر قبضہ کرلے اور یہ
زمین کی پیداوار پر قبضہ کریں۔ حکومت ٹیکس لے یہ نذرانہ لیں۔ حکومت بیعت لے یہ
حلقہ ارادت میں شامل کریں، حاکم محل میں رہیں یہ خانقاہوں میں رہیں اور اس کو شاہی
محل سے بھی بہتر بنادیں دونوں جگہ گدی چلی، جھگڑے ہوئے، قتل ہوئے، قبضے ہوئے،
انہوں نے تلوار کو ذریعہ بنایا۔ انہوں نے تسبیح کو تلوار بنایا۔ انہوں نے کھل کر ریشمی زندگی
بسر کی۔ انہوں نے ٹاٹ پہن کر ریشمی زندگی حاصل کی۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے اس فرقہ کی گمراہی واضح کی۔ اس کے خلاف علمی
جہاد کیا اور عملی مقابلہ اس طرح کیا کہ ضعیفی اور بڑھاپے میں دو غلاموں کے سہارے جلتی
دوپہر میں اپنے باغ اور کھیتی کی دیکھ بھال کے لئے جایا کرتے تھے۔ ایک دن صوفیوں

کے سردار نے ملاقات کی، تا کہ اعتراض کر کے اپنے حامیوں میں اہمیت حاصل کریں اور ان کی تعداد میں اضافہ کر لے۔ بڑے طمطراق سے مع اپنی جماعت کے امامؑ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اگر اس وقت موت آجائے تو کیسی بُری موت ہوگی اور آپ کا ایسا فرزند رسولؐ اس طرح دنیا حاصل کرے۔ بہت معیوب بات ہے۔ حضرت نے غلاموں کا سہارا چھوڑ دیا۔ تن کر کھڑے ہوئے اور فرمایا میں اپنے عیال کی روزی حاصل کرنے جا رہا ہوں اگر اس وقت موت آجائے تو بہترین موت ہوگی کیونکہ میں بہترین عبادت میں مصروف ہوں۔

دین اور دنیا میں کوئی لڑائی ممکن نہیں ہے ایک کو خدا نے پیدا کیا ہے دوسرے کو خدا نے بھیجا ہے۔

دین نام ہے دنیا کو صحیح بنانا۔ دنیا کو جنت کا نمونہ بنانا۔ دنیا کے دوزخ کو اطاعت خدا کے ذریعہ بجھانا۔ یہی پیغام تھا جسے ہمارے پانچویں امامؑ نے خاص طور پر پیش کیا۔ کیونکہ صوفی فرقہ نے اسی عہد میں جنم لیا تھا۔

۵۷ھ کی یکم رجب کو امام محمد باقرؑ پیدا ہوئے۔ جب آپ کے دادا امام حسینؑ زندہ تھے۔ آپ کربلا میں ۳ر سال کے تھے جب قیدی بنے۔

اور ۱۱۴ھ میں ذی الحجہ میں امام صادقؑ کو دین سونپ کر خدا کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ آپ زہر سے شہید کئے گئے اور جنت البقیع میں مدینہ منورہ میں دفن ہوئے۔

واپسی

آنا جانا اس دنیا کی ریت ہے۔ آدمی آتے جاتے ہیں۔ مال آتا جاتا ہے۔ سواریاں آتی جاتی ہیں۔ باراتیں آتی جاتی ہیں۔ مہمان آتے جاتے ہیں۔ دولت، نعمت، راحت، شہرت، عزت، صحت، بیماری، درد، تکلیف، غربت، غرضکہ ہر چیز اس دنیا کی آنی جانی ہے۔ البتہ کچھ چیزوں کا آنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کچھ چیزوں کا جانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اچھے معلوم ہونے میں بھی ذوق، پسند، علم، عقل، تجربہ اور ضرورت کو دخل ہوتا ہے۔ ایک چیز کا آنا ایک شخص کو اچھا معلوم ہوتا ہے تو اسی وقت اسی جگہ، اسی چیز کا آنا دوسرے کو بہت برا معلوم ہوتا ہے۔

بہرحال برا معلوم ہو یا اچھا معلوم ہو۔ آنے والا آ ہی جاتا ہے اور جانے والا چلا ہی جاتا ہے۔ جسے نہیں آنا ہوتا ہے۔ لاکھ کوشش کرو نہیں آتا ہے۔ جسے نہیں جانا ہوتا ہے لاکھ تدبیر وعلاج کرو نہیں جاتا ہے آدمی کے دماغ میں لاکھوں غرور کے سودے ہوں۔ ہزاروں تدبیروں پر ناز ہو مگر کبھی کبھی سب تدبیریں فیل ہو جاتی ہیں اور ناکامیابی اللہ والا بنا دیتی ہے۔ رحم دل اور شفیق بنا دیتی ہے۔ خاکسار اور متواضع بنا دیتی ہے۔ اور کوئی ایسا بدنصیب بھی ہوتا ہے جس کو ناکامیابی مایوس بنا دیتی ہے۔ اسے شرافت اور ایمان کی دولت سے۔ اخلاق کی نعمت سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ کامیابی ہو یا ناکامیابی دونوں کے اچھے اثرات بھی پڑتے ہیں اور برے اثرات بھی ہوتے ہیں۔ دراصل ساری بات اس پر

منحصر ہے کہ زمین قلب وذہن شور اور بنجر ہے یا اس میں روئیدگی اور بالیدگی کی صلاحیت ہے۔ اچھی زمین کو سورج کی تمازت بھی فائدہ پہنچاتی ہے اور بارش بھی اور بنجر زمین کو دھوپ بھی نقصان پہنچاتی ہے اور پانی بھی، کوئی دل، کوئی دماغ اس وقت تک صحیح اور درست نہیں ہوسکتا جب تک اسے اللہ اور قیامت کے دن کا یقین نہ ہو اور ان عقیدوں کی آبیاری حضورؐ اور اہلبیت علیہم السلام کی سیرت وارشادات سے نہ ہوئی ہو۔ جو دل ودماغ خدا اور قیامت کو مانتے ہیں اور اپنے افکار وعادات واطوار سب اپنے نبیؐ وامامؑ سے وابستہ کیئے رہتے ہیں ان کے ایمان میں کامیابی سے بھی اضافہ ہوتا ہے اور ناکامیابی سے بھی۔ کامیابی ان میں شکر خدا کے جذبہ میں اضافہ کرتی ہے اور ناکامیابی دعا، تضرع، زاری وصبر میں اضافہ کرتی ہے۔ چیزوں کی طرح آدمی کے دل ودماغ میں بھی خیالات اور آرزوئیں آتی جاتی رہتی ہیں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جس کے دماغ میں موت کا خیال رہتا ہے اس کے دماغ سے دنیاوی نفع نقصان کے سارے خیالات چلے جاتے ہیں اور جس کے دماغ میں آخرت کے عذاب اور ثواب کا خیال آجاتا ہے اس کے دماغ سے موت تک کا خیال چلا جاتا ہے۔ مولائے کائنات حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ صرف وہ کام کرو صرف وہ آرزو رکھو۔ صرف ایسی عادتیں اختیار کرو جو مرنے کے بعد کام آئیں اس لئے کہ تم یہاں آئے ہو جانے کے لئے نہ کہ رہ جانے کے لئے لہٰذا جہاں جانا ہے فکر وحوصلہ سب وہاں سے وابستہ رکھو۔

آنا جانا یہ دو لفظیں ہیں جن کے مجموعہ کا نام دنیا ہے۔ اگر دنیا کا تجربہ کیا جائے تو آنا اور جانا یہی دو لفظیں اس کی حقیقت ثابت ہوں گی۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک زبردست حقیقت ہے کہ عموماً آنا اچھا لگتا ہے اور جانا برا معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے خوش

آمدید کا لفظ ہر زبان میں پایا جاتا ہے مگر الوداع کے لفظ میں سوگ ہے خوشی اور مسرت نہیں ہے۔

اس مضمون کے لکھنے کا خیال بھی ایک سفر نے پیدا کیا۔ جب ہم جا رہے تھے تو لوگ گھر تک لینے آئے تھے۔ خطوط آئے تھے کہ تشریف لائے۔ ہم آپ کی آمد کے منتظر ہیں۔ اسٹیشن پر اترتے وقت خوش آمدید کہنے والوں نے بڑی پر جوش مسرت کا اظہار کیا۔ ملے، ملایا، کھلایا، پلایا، نہلایا، دھلایا، کپڑے تبدیل کرائے صبح وشام خبر لی۔ کوئی نہ کوئی ہر وقت موجود رہا۔ سامان اٹھانا بڑی بات کوئی اٹھ کر پانی بھی نہیں پینے دیتا تھا۔ اگر محبت کرنے والوں کا بس چل جاتا تو وہ کوئی کام بھی نہ کرنے دیتے بلکہ ہمارے سارے کام وہی کر دیتے۔ مگر کھانا، پینا، سونا، جاگنا، اٹھنا بیٹھنا اور تمام حوائج ضروریہ کو کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا تھا۔ محبت کرنے والوں کی ہی مجبوری تھی۔ جہاں وہ ہم کو کام کرنے دیتے تھے غرض کہ رہے، سہے ادھر پروگرام پورا ہوا۔ ادھر آؤ بھگت ختم ہوئی۔ چل چلاؤ شروع ہوا۔ روشنی والے روشنی لے گئے۔ ڈیکوریشن والے اپنا سامان لے گئے۔ جگہ ویران اور اجاڑ ہوگئی۔ اندھیرا بھی ہوگیا۔ نوکر چاکر، باورچی سب رخصت ہوئے۔ باورچی خانہ بند ہوا۔ شامیانہ اتر گیا۔ عمومی مہمان رخصت ہوئے۔ صرف ہم خصوصی مہمان باقی تھے۔ تھکے ماندے لوگوں نے ہم کو بھی ممکن مجمع کے ساتھ رخصت کیا۔

بس میں بٹھا دیا۔ جب بس چلی تو ہم اکیلے تھے۔ بس ہمارا سامان ہمارا ساتھی تھا۔ بس سے اترے اسٹیشن پر آئے، ٹکٹ کی فکر کی، لائن میں کھڑے ہوئے۔ سامان کی نگرانی کی۔ اسٹیشن پر پہنچے۔ اب سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ کس طرح گاڑی میں جگہ مل جائے۔ جن لوگوں کا ریزویشن تھا وہ لپک لپک کر سوار ہو رہے تھے۔ کنڈکٹر ان کو آواز

دے کر بلا رہے تھے۔ہم اپنا سامان کاندھے پر لادے ہر دروازے کے سامنے تھوڑی دیر تک جگہ کے بھکاری بنے کھڑے رہتے۔ پھر جگہ نہیں ہے کہ گرجدار ڈانٹ سن کر دوسرے ڈبہ کی طرف بڑھ جاتے۔شروع سے آخر تک ساری گاڑی چھان ماری مگر نہ جگہ ملی۔نہ منزل پر پہنچے۔ بلکہ اسٹیشن پر پڑے رہ گئے جہاں چور، جیب کترے، اٹھائی گیرے سب ہی ٹہل رہے تھے، سامان آدمیوں سے بچاؤ، کھانا کتوں سے بچاؤ، جسم کو مچھروں سے بچاؤ۔مگر وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔بس دو ہی باتیں تھیں جن کے ساتھ کاش لگا ہوا تھا۔ کاش پہلے سے ریزوریشن کرالیا تھا یا کاش اتنے پیسے ہوتے کہ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خرید سکتے۔مگر مشکل تو یہی ہے کہ کاش تمنا تو بن سکتا ہے مگر مسائل کا حل نہیں بن سکتا ہے۔

سو دو سو میل کا یہ چھوٹا سا سفر تھا مگر اسی میں ہماری بدحالی اپنی انتہا پر تھی اور ہم سوچ رہے تھے آنا کتنا آسانی ہے اور واپس کتنی مشکل ہے۔ہم خالی ہاتھ خالی دماغ بیٹھے تھے اور خالی دماغ میں خیالات کی ہوائیں سن سن چل رہی تھیں۔اس سفر کی ابتدا یاد آئی۔ پھر گھر کا آرام یاد آیا پھر زمانہ تعلیم یاد آیا پھر بچپن یاد آیا۔ ماضی کو یاد کرتے کرتے غنودگی سی طاری ہونے لگی۔آنکھیں کھلی تھیں یا بند یہ یاد نہیں۔مگر دماغ کے دریچے کھلے تھے۔یاد آیا کہ ہماری پیدائش کی ماں باپ، دادا، دادی سب کو بڑی تمنا تھی دعاؤں کے ذریعہ ہم دنیا میں بلائے گئے تھے جب ہم نے زمین پر قدم رکھا تو مارے ماحول میں خوش آمدید کی بھرپور مسرتیں پھیل گئی تھیں۔پھر سب نے پوری محبت کے ساتھ پالا۔کھلایا پلایا۔ پہنایا، اڑھایا، پروان چڑھایا، پڑھوایا لکھوایا۔ دھوم دھام سے شادی گھر آباد ہوگیا۔زندگی نے سارے نشیب وفراز طے کر لئے ہم نے بڑھاپے میں قدم رکھے۔معدہ کمزور، آنکھیں کمزور، ارادے کمزور، زندگی اجاڑ۔امراض کے حملے، افکار کے حملے، احباب کے حملے،

غموں کے حملے، بس اب واپسی ہے۔واپسی۔بس ایک موت کا حملہ باقی ہے جس دن وہ بھی ہوگیا، لوگ قبر تک پہنچا آئیں گے۔قبر میں اتار آئیں۔اس کے بعد جنت جانے والی گاڑی میں جگہ ملے گی یا نہیں۔ ہمارے سامنے بس یہی ایک مسئلہ ہوگا۔اگر ایمان اور مکمل پابندی کی کوشش کے ذریعہ ہم نے پہلے سے ریزرویشن کرالیا ہے تو فرشتے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ وادیٔ السلام میں بٹھائیں گے اور جنت کا ٹکٹ دلائیں گے ورنہ آدمی کرنے کے بعد سے لے کر خدا کے سامنے حاضر ہونے تک ہر منزل پر ہر قدم پر بس یہی کہتا رہے گا۔اے کاش ہم نے ایمان اور مکمل پابندی دین کے ذریعہ ریزرویشن کرالیا ہوتا اور اتنا ذخیرہ آخرت جمع کر لیا ہوتا کہ جنت کی گاڑی میں فرسٹ کلاس بلکہ ایر کنڈیشنڈ کا ٹکٹ لے سکتے۔ جو کل سامنے آتا ہے اسے آج سوچنا ہے جو سوچنا ہے اس کا فیصلہ کر کے عمل کرنا ہے ورنہ صرف سوچنا بھی کام نہیں آتا ہے۔

سچ ہے دنیا میں آنا بہت آسان ہے اور واپسی بہت مشکل ہے۔ اے کاش....اے کاش۔

شارٹ کٹ

دو مبلغ سفر کرتے ہوئے ایک جگہ پہنچے۔ جہاں سے چلے تھے ان لوگوں نے تھوڑا ناشتہ ساتھ کر دیا تھا۔ جہاں ٹھہرے وہاں ناشتہ میز بان کے حوالے کر دیا۔ ۳ ر بجے سہ پہر کو دوپہر کا کھانا آیا۔ میز بان بھی شریک تھے۔ ۳ ر آدمیوں میں ۴ ر چپاتیاں تھیں۔ صبر وشکر کے ساتھ کھانا ہو گیا۔ اور یہی خیال آتا رہا کہ کاش اپنا ناشتہ ہی رکھ لیا ہوتا۔ شب میں بھی میز بانی کی وضعداری میں فرق نہ آیا۔ صبح کو دونوں مبلغ خود ہی روانگی کے لئے بے چین تھے۔ تبلیغ اور مہمان سے چھٹکارے کا یہ شارٹ کٹ تھا۔

کبھی زمینداری تھی۔ ہر اما مباڑہ میں ذاکر آتا تھا۔ زمینداری ختم ہوگئی۔ وراثت میں ذاکر بلانے کی ذمہ داری رہ گئی۔ بجلی کے پنکھے کی ہوا نقصان کرتی ہے۔ لاؤڈ اسپیکر کی آواز کانوں کو بری معلوم ہوتی ہے۔ گلیوں گلیوں نکل چلئے۔ چھوٹے راستے سے سواری سے پہلے پہنچ جائیں گے یعنی گرمی سہنا۔ پیدل چلنا، گلا پھاڑنا ذاکر کے حصے میں آیا۔ اور خرچ کے شارٹ کٹ میز بان کے حصے میں آئے۔

سکنڈ ڈویژن تو دھرا ہے یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے۔ کیونکہ سال بھر میں چند دن پڑھا تھا۔ کچھ آگے والے کی کاپی دیکھی۔ کچھ سوچا اور جوابات اپنے خیال میں ایسے لکھ دیئے کہ فرسٹ آنے میں اگر شبہ بھی تھا تو سکنڈ پاس ہونے کا تو پکا یقین تھا۔ لیکن رزلٹ میں فیل نکلے۔ ۳ ر سال کا کورس ۷ ر سال میں کیا۔ کیونکہ علاوہ تعلیم کے ہر کام میں

دخیل رہتے تھے اور ڈگری، ملازمت خوش حالی، عزت تک شارٹ کٹ کے ذریعہ پہنچنا چاہتے تھے۔ نتیجہ میں شارٹ کٹ لانگ روٹ میں تبدیل ہو گیا۔

ڈیوٹی سے آتے ہی معمہ بھرنے میں لگ گئے۔ بیوی چولہا جلائے بیٹھی سلگ رہی ہیں کہ میاں بازار سے جا کر سودا لے آئیں تو ہانڈی مکمل ہو۔ مگر میاں معمہ حل کر رہے ہیں۔ معمہ تو حل نہ ہوا۔ البتہ گھر میں جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑے کے بعد گئے بھی تو دماغ معمہ میں لگا رہا۔ آدھا سودا لائے آدھا نہیں لائے بلکہ اس کے بجائے دوسرا سامان اٹھا لائے۔ لڑتے ہوئے گئے لڑتے ہوئے آئے۔ واپسی پر مزید جھگڑا ہو گیا۔ سامان پھینکا بیوی کو چولہے میں جھونکا اور معمہ میں لگ گئے۔ ہزاروں معمہ بھر کر مزید بھیج دیئے مگر کبھی انعام نہیں نکلا یہ شارٹ کٹ سے دولتمند ہونا چاہتے تھے مگر گھر سے پیسے بھی گئے اور جھگڑے کھڑے ہو گئے۔

درجنوں لاٹری کے ٹکٹ ہر ماہ خریدے۔ اور لاٹری کھلنے کے دنوں کا انتظار کرتے رہے۔ ہمیشہ جاگتے میں لکھ پتی ہونے کا خواب دیکھتے رہے۔ پیسے بھی گئے۔ حرام میں خرچ کرنے کے گناہ گار بھی ہوئے۔ انتہائی کرب میں زندگی بسر کی۔ چڑچڑے ہو گئے۔ لوگ سنکی کہنے لگے گھر باہر سب جگہ زندگی مشکل ہو گئی۔ لاٹری نکلنے کی امید میں قرضدار بھی ہو گئے شارٹ کٹ سے امیر بننے کی کوشش اور غریب ہو گئے۔ قرض بڑھا۔ عزت گھٹی۔

گلا اچھا ملا تھا۔ لوگوں نے گلا استعمال کر لیا۔ میرا کلام پڑھ دو۔ میرا کلام پڑھ دو۔ ساتھ جانے لگے عزت پانے لگے کبھی کبھی کسی نے کچھ کہہ کر دے دیا۔ کلام اور گلا۔ مشاعرہ و مقاصدہ لوٹ لیا۔ شارٹ کٹ سے شاعر ہو گئے مگر نہ تعلیم۔ نہ صلاحیت۔ آخر

چوری کا کلام پڑھنے لگے۔غلط بھی ناموزوں بھی یہاں تک کہ مطبوعہ کلام بھی پڑھنا پڑا۔
پڑھائی کا زمانہ گذرتا گیا اور یہ مشاعرے پڑھتے رہے۔کنٹھا پوٹا۔گلا رخصت،عزت ختم
دعوتیں معدوم۔جوتے کا کام سیکھنے گئے دل نہ لگا۔زردوزی میں جی نہ لگا۔کھانا تو درکنار
بیڑی بیڑی کو محتاج ہیں۔لق ودق زندگی کیسے گذرے۔کون پوچھے عزت کے شارٹ
کٹ نے ذلت پیدا کردی۔علاوہ حرام موت کے اس سے نجات پانے کا کوئی ذریعہ نہیں
مگر خودکشی کے شارٹ کٹ کے بعد دوزخ کی دائمی آگ ہی آگ ہے۔

حافظہ تیز تھا۔گھر میں ذاکروں کے فضائل اور قصائد بیان ہوتے تھے۔فلاں
نے اتنا کما لیا۔کار ہے۔بلڈنگ ہے۔اتنے مشہور ہوگئے سن سن کر صاحبزادے کو ذاکر
بننے کا شوق ہوگیا۔مجلسوں میں پابندی سے شرکت کرنے لگے۔ٹیپ جمع کرنے لگے۔
آئینہ کے سامنے مشق تقریر کرنے لگے۔پہلے محلّہ میں پڑھی۔پھر شہر میں پھر باہر نکلے۔
پارٹی میں شامل ہوکر۔ذاکر ہوگئے۔دین سے نہ کوئی مطلب تھا۔نہ کوئی ہوسکتا تھا۔
والدین خوش کہ گھر جنت بننے لگا۔صاحبزادے خوش کہ مشہور ذاکر ہوگئے۔سامعین خوش
کہ مجلس زوردار ہوئی۔بانی مجلس خوش کہ مجلس کامیاب رہی۔صرف حسینؑ ناخوش تھے کہ
کاش تم علم دین حاصل کرکے ذاکر ہوتے تو میں نے اپنے خون سے جس دین کو بچایا تھا۔
تمہارے بیان سے اس دین کا خون نہ ہوتا۔مگر ذاکر اور ان کے خاندان کا خون مارے
خوشی کے بلیوں اچھل رہا ہے کہ بغیر پڑھے لکھے ڈائیلاگ اور ذاکرین کے کیٹلاگ کے
شارٹ کٹ سے یہ کماؤ ذاکر ہوگئے۔

ایسی پابندی سے آغاز بلوغ سے ڈاڑھی مونڈی کہ گھر والے اور ساتھی سب
اس دھوکہ میں رہے کہ غریب کے ڈاڑھی نکلی نہیں۔قد لمبا ہوا۔قبا بھی لمبی ہوگئی۔اگر

ڈاڑھی بھی ہوتی تو ماہ مبارک میں بڑے ٹھاٹھ باٹھ کے شاندار پیش نماز ہوجاتے۔مگر وہ
رمضان سے ایک ہفتہ قبل ہمیشہ غائب ہوجاتے اور عید کا چاند بن کر نکلتے۔معلوم ہوتا کسی
دور دراز صوبہ میں تھے یہ ساری زندگی خواجہ سرا رہتے وہ تو ایک دن مدرسہ میں ان کا ایک
ماموم معلوم نہیں کیسے ٹپک پڑا۔تو غائب ڈاڑھی کا پتہ چلا۔اس غیر عادل ماموم نے اپنے
امام کی عدالت کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ڈاڑھی غائب تھی۔عدالت غائب تھی۔نماز میں قرأت
بھی غائب تھی مگر مسائل سے جہالت موجود تھی۔مگر ماموم بھی تو جاہل تھے۔ایسوں کو تو
بے غسل و وضو پڑھانا چاہئے انہوں نے بنابر تقدس ہمیشہ وضو سے پڑھائی۔اس حادثہ
کے بعد ماہ رمضان کے تمام پیش نماز شعبان سے ڈاڑھی بڑھانا شروع کردیتے ہیں اور
عید بعد قصر ریش کردیتے ہیں۔صرف ڈاڑھی کے ذریعہ پیش نماز درکار ہے۔پیش نماز بھی
دام بچھائے ہیں ان کے دام لگ گئے۔وہ دام میں آگئے۔آخری لڑائی دونوں دوزخ میں
لڑلیں گے وہاں تو بڑے بڑے امام و ماموم لڑ رہے ہوں گے۔ایک کونے میں ان کا بھی
حقیر سا دنگل ہوجائے گا۔پھر لڑ بھڑ کر بھی ایک ہی جگہ تو رہیں گے۔

یہاں کب دستار فضیلت باندھنے جارہے ہیں۔اب نجف تو جانا نہیں ہوتا قم
جانا پڑے گا۔معتقد نے جناب سے صاحبزادے کے لئے پوچھا۔جو آج تو سنیما جارہے
ہیں۔وہ کل جب آئے گا تب آئے گا جب قم جانا ہوگا اور کیسے جانا ہوگا وہاں تو اب لمعہ کا
امتحان ہوتا ہے۔لمعہ تو باپ نے بھی نہیں پڑھی تھی مگر نجف جاکر جناب ہوآئے تھے۔لمعہ
کی شکل کا حل نکالا دور کا سفر کیا۔باپ واپس آگئے۔بیٹے کہیں امام جمعہ و جماعت
ہوگئے۔اب جو پلٹے تو شارٹ کٹ سے جناب ہوچکے تھے۔جناب ہونا خود بھی مجتہد اور
فقیہ ہونے کا شارٹ کٹ ہے۔

غرضکہ شارٹ کٹ یعنی اپنے کو بھی دھوکہ دیتا ہے اور دوسرے کو بھی دھوکہ میں رکھنا ہے۔ بلیک کے شارٹ کٹ سے لکھ پتی ہونا۔ سنجے کے ۵؍نکاتی اندرا کے ۲؍نکاتی پروگرام کے شارٹ کٹ سے نیتا۔ وزیر اور پارٹی کا عہدہ دار ہونا۔ دل بدلی کے شارٹ کٹ سے منسٹر ہونا اگر قابل مذمت ہے تو جاہل کا شاعر بن جانا دین سے بے بہرہ کا ذاکر ہوجانا۔ بے علم و بے عمل پیش نماز ہوجانا۔ لباس کی بنیاد پر مجتہد ہوجانا بھی قابل مذمت ہے۔ اور قابل عذاب بھی۔ ان کو آخرت میں عذاب ہوگا اور یہ دنیا میں دوسروں کے لئے عذاب بنے رہیں گے۔

لیکن اصول دین کو پڑھے۔ سمجھے اور مانے بغیر صرف سن کر اپنے کو مسلمان مومن، محبِّ اہلبیتؑ سمجھ لینا اور واجبات چھوڑ کر گناہوں میں ڈوب کر صرف چند نذریں اور مجلس کر کے اور تھوڑے سے کار خیر انجام دے کر اپنے کو پکا جنتی سمجھ لینا۔ ہماری بڑی خطرناک بھول ہے۔ کیونکہ ہم اس شارٹ کٹ سے اپنے کو دوزخ میں کھڑا پائیں گے۔ اس کے بجائے علم دین حاصل کر کے معرفت وایمان حاصل کریں اور عمل صالح کو اپنائیں تاکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے داخل جنت ہوں۔

کٹ پیس

سستا اور مہنگا دونوں لفظ ہمارے سماج پر چھائے ہوئے ہیں۔ سب کو سستے کی فکر ہے اگر چہ اکثر سستے کی فکر میں مہنگے آدمی سستے ہوجاتے ہیں اور سستا سامان مہنگا خرید لاتے ہیں۔ کٹ پیس کی مقبولیت واہمیت کی وجہ یہی ہے کہ مہنگی چیز سستی مل جائے گی۔ تھان کے آخر میں جب بے جوڑ ٹکڑا بچ جاتا ہے تو اس کا شمار کٹ پیس میں ہوجاتا ہے۔ سمجھدار دوکان دار تو ایسے ٹکڑے ہی نہیں کاٹتے کہ آخر میں بے تکا ٹکڑا بچ جائے مگر کم ناپنے کی وجہ سے کبھی مل کے کاریگر تھان چھوٹا کر دیتے ہیں اور کبھی دوکاندار چھوٹا ٹکڑا بچا لیتے ہیں۔ اس طرح کٹ پیس عالم وجود میں آجاتا ہے۔

کٹ پیس سے فائدہ اٹھانے والے بھی ہیں اور نقصان اٹھانے والے بھی۔ مثلاً دوکاندار اصل اور نفع سب کما چکا مگر اس کے پاس بہت سے ٹکڑے بچ گئے ان کے بیچنے کا آسان راستہ نکالا جس دام پر بکے لاٹ کی لاٹ بیچ ڈالو۔ جو بھی مل جائے وہ نفع ہی نفع ہے۔ چنانچہ کٹ پیس خود ایک بزنس ہوگیا۔ اس کے تھوک بیوپاری بھی ہیں اور خوردہ فروش بھی۔ خوردہ فروش فٹ پاتھ پر دوکان لگائے بیٹھے ہیں اور کچھ گاؤں، گلیوں میں آواز دیتے چکر لگا رہے ہیں۔ اور عورتوں کو چکر آرہے ہیں کہ کس طرح سستا مال خریدا جائے۔ کس طرح ایک ٹکڑے سے لباس تیار کیا جائے۔ یا دو ٹکڑے ایسے مل جائیں کہ کپڑا نہ گھٹے نہ بچے۔ یہ بھی فکر ہے کہ رنگ میں فرق نہ ہوجائے۔ ورنہ کٹ پیس کا کپڑا ہے یہ

بات پکڑ نہ لی جائے گی۔ دوکاندار مچھلی کے شکاری کی طرح بیٹھا ہے کہ مچھلی چارہ نگل لے تو پھر کہاں جائے گی۔ اس کی نگاہیں جانچ رہی ہیں کہ کون سا کپڑا پسند آ گیا۔ پسند کے بعد دوکاندار کی پسندیدہ قیمت میں سستا کپڑا مہنگا خریدا خوشی بھی رہے گی کہ سستا مل گیا۔ سچی بات یہی ہے کہ کوئی دوکاندار کبھی نقصان میں نہیں بیچتا۔ البتہ خریدار کو اطمینان ولا دیتا ہے کہ آپ کی وجہ سے ہم نقصان میں بیچ رہے ہیں۔

کٹ پیس کا کاروبار زندگی کے ہر حصہ میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً دعوت میں مہمان کم آئے یا کھانا زیادہ پک گیا یا مہمانوں سے توقع سے کم کھایا۔ غرضکہ کھانا بچ رہا۔ جس وقت دعوت کا پروگرام بن رہا تھا اس وقت کچھ غریب عزیز دوست یا پڑوسی یاد آتے تھے۔ مگر ان کو امیروں کے ساتھ بلانا اس لئے پسند نہیں آیا کہ غریب عزیز یا دوست یا پڑوسی امیروں کے درمیان ہماری غربت کی علامت بن جائیں گے اور جس عزت کے حاصل کرنے کے لئے ہم دعوت کر رہے وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا کیونکہ ہم نے تو دعوت دینے کو امیر ظاہر کرنے کے لئے ہی کی ہے۔ چاہے اس کے بعد ہمارا گھر اور غریب ہو جائے ہمارے بچے اور غریب حالت میں رہیں مگر دعوت کے دن تو عزت بچ جائے۔

قسمت دیکھئے کہ اسی دن ایک غریب عزیز گاؤں سے آ گئے۔ جو مسئلہ بن گئے ان کو چھپایا کیسے جائے۔ امیروں نے دیکھ لیا تو عزت چلی جائے گی اور ان سے دعوت کیسے چھپائی جائے اگر انہوں نے دعوت دیکھ لی تو عزیزداری تو ہمیشہ کی ہے۔ دعوت تو ایک دن کی ہے۔ ہمیشہ طعنہ کون سنے گا۔ غرضکہ عزیز کے لئے گھر نکالا، منصوبے تجویز ہونے لگے پلان پر پلان بنے۔ آخر میں ایک دوسرے عزیز کو طلب کیا گیا جو دیہاتی

عزیز کو لینے آئے اور پلان کے مطابق یہ کہتے ہوئے لے گئے کہ آج تو آپ ہمارے یہاں رہیں گے ان کے یہاں تو آتے ہی رہتے ہیں۔ یہ عزیز کو لینے نہیں آتے ہیں بلکہ غربت، دیہاتیت وغیرہ کا ڈھیر اٹھانے آتے ہیں اور ڈھیروں احسان کرنے آئے ہیں۔ عزیز کو لینے نہیں آتے ہیں بلکہ چپک جانے والے عزیزداری کو چھڑانے آئے ہیں۔ غرضکہ عزیز کو عزیز اٹھالے گئے تب جان عزیز نے اطمینان کی سانس لیا۔ مگر بدقسمتی سے ایک شریف بھوکا اس وقت کھانے کا سوال کرنے لگا جب کھانا تیار تھا۔ مگر بڑے مہمان نہیں آئے تھے جن کے انتظار میں میزبان کباب ہو رہے تھے البتہ چھوٹے مہمان آ گئے تھے۔ جو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنے گرم اور لعن طعن والے فقیروں سے میزبان کی بریانی ان کی کھوپڑی میں دم کر رہے تھے۔ بھوکے سائل پر میزبان بھوکے شیر کی طرح جھپٹ پڑے۔ پیٹ بھر گالیاں دیں۔ بھوکے کا پیٹ کئی سال کے لئے گالیوں سے بھر دیا۔ گالیوں کا کچھ تحفہ بھوکے کے مرحوم والدین کو قبر میں بھیج دیا۔ کچھ اس کی کنواری پاک دامن بہن اور بیٹی کے لئے بطور جہیز دیدیا۔ بھوکا چلا گیا مگر دور تک گالیاں اس کو رخصت کرنے کے لئے آتی رہیں۔ بھوک سے اس کا دماغ سنسنا رہا تھا۔ گالیوں سے اس کے کان بج رہے تھے۔ خدا اس کے صبر کو دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس گھر پر چلا گیا تھا جہاں اس کی روزی تو نہیں اتری تھی۔ مگر یہ ہدایت اتری تھی کہ سوال کرنا عزت کا بیچنا ہے۔ لہٰذا ہمیشہ شریف دیکھ کر سوال کرو۔ نااہل سے سوال نہ کرو۔ بھوکے کو ایک شخص نے آواز دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو پکارنے والا اس کا مسجد کا ساتھی تھا۔ جو اس کی طرف دوڑنے کی حد تک لپک رہا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے سوال کیا۔ آج ہی آپ مسجد میں نہ آ سکے۔ اور آج ہی میرے گھر کچھ مہمان آ گئے۔ میں نے ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

بچہ کا عقیقہ کر دیا۔ مجھے امید تھی کہ آپ مسجد میں مل جائیں گے تو آپ کو مدعو کرلوں گا۔ پروگرام اچانک بنا تھا ورنہ صبح کی نماز میں وعدہ لے لیتا۔ جب آپ مسجد میں نہیں آئے تو میں بڑے افسوس میں تھا کہ آپ کی شرکت کے بغیر میرے گھر میں برکت کی کمی رہ جائے گی۔ مگر میری خوش نصیبی دیکھئے کہ میں برف لینے نکلا تھا کہ آپ بھی مل گئے۔ برف بھی مل گئی اور آپ کو دیکھ کر میری آنکھوں کو بھی ٹھنڈک مل گئی۔ بھوکا آج بھوک کی شدت سے سمجھ نہ جاسکا تھا۔ غیرت کی بنا پر کسی سے کچھ کہہ بھی نہ سکا تھا تلاش معاش میں دور کے محلّہ میں نکل گیا تھا۔ جب دم نکلنے لگا تھا تو اس نے کھانے کی پھیلی خوشبو کے سہارے سوال کرلیا تھا جس کا حشر بھی اس نے دیکھ لیا تھا اور اب اپنے خالی گھر خالی پیٹ واپس جا رہا تھا۔ مگر روزی اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ جس وقت یہ بھوکا اپنے مسجد کے نمازی کے گھر میں داخل ہوا اسی وقت دعوت والے گھر میں بڑے مہمان داخل ہوئے۔ جن کے لئے میزبان فرش ہوئے جا رہے تھے۔ اور ان کے دیر میں آنے کی وجہ سے باقی مہمان خفیہ طور پر ان کو بھر منھ گالیاں دے رہے تھے۔ اور اعلانیہ خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

غرضکہ دعوت ختم ہوئی۔ مہمان رخصت ہوئے، کھانا بچ رہا جو فریج میں رکھا جاسکتا تھا وہ رکھ دیا گیا۔ باقی کے سڑنے کے یقین نے گھر والوں کو دعوت کی اس ''کٹ پیس'' کے بارے میں غور کرنے پر مجبور کیا۔ گئی رات کے اس حصہ میں کھانا کس کو دیا جائے۔ فقیر ڈھونڈھے گئے۔ انہوں نے کھانا تو لے لیا مگر نیند میں مست تھے۔ سرہانے رکھ کر سو گئے۔ البتہ کتے جن کو رات میں نیند نہیں آئی۔ انہوں نے کھایا۔ کوئی نظر نہ آنے والا کہہ رہا تھا۔ حق بہ حقدار رسید اور مہمان۔ میزبان۔ اور کتے سب صبح کو خراٹے لے رہے تھے۔

ادھر بھوکا جب اپنے میزبان کے گھر میں داخل ہوا تو سب سے بڑا مہمان وہی تھا۔ باقی مہمان اس سے ملاقات کے بھوکے تھے۔ میزبان سے اس کی عبادت، محبت، ایثار کے واقعات پر واقعات سن چکے تھے۔ سب نے کھانا کھایا۔ شکر خدا ادا کیا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ بھوکا دو وقت کا بھوکا تھا کیونکہ دو دن سے اسے مزدوری نہیں ملی تھی۔ پھر باتوں کا سلسلہ دراز ہوا تو کسی نے پیر بھی دراز نہیں کئے اور صبح ہونے لگی تو سب نے پہلے نماز شب پڑھی پھر مسجد میں بہ جماعت نماز صبح پڑھی۔ اور ایک دوسرے سے گلے مل کر رخصت ہوئے۔ میزبان بار بار شکر ادا کر رہا تھا کہ اس کو اصلی مہمان مل گیا۔ جس کی بھوک کا کسی کو علم نہ تھا۔ اور بھوکا بار بار استغفار کر رہا تھا کہ مالک معاف کر دے میں نے تجھ سے کیوں نہ مانگا۔ صبح کو اسے پھر کام مل گیا۔ ظہرین میں سب کی ملاقات پھر مسجد میں ہوئی اور سب کے دل چہرہ تک خوش تھے۔

ادھر صبح ہوئی تو عزیز نے عزیز کو چھوڑ دیا۔ اسی لئے کہ رات بھر رو کے رکھنے کا وعدہ تھا۔ اور عزیز اپنے پرانے ٹھکانے پر پہنچا تو دیکھا نہ کوئی چیز ٹھکانے سے ہے اور نہ کوئی آدمی ٹھکانے پر ہے۔ سب سامان پھیلا پڑا ہے۔ سب بے سدھ پڑے ہیں۔ سب کو جگایا۔ اپنی حاضری لکھائی اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا کہ کل دعوت کے لئے ہم کو گھر سے نکالا آج فریج سے کھانا نکال کر ہم کو نہ کھلاؤ۔ ہم عزیز ہیں کتے نہیں۔ کھانے کے لئے نہیں عزت کے لئے ملتے ہیں۔ خیرات کی کٹ پیس کام نہ آئی۔

مرنے والے نے ساری زندگی خمس نہیں نکالا۔ کفن کا خمس اگر نکالا گیا تو یہ خمس کا کٹ پیس ہے ساری زندگی کے اعمال برباد ہوئے کیونکہ خمس نکالے بغیر اعمال کئے تھے۔ البتہ حج و زیارت کے وقت خمس کا کٹ پیس نکال دیا تاکہ خرچیلی عبادت ضائع نہ ہونے

پائے۔

مذہب اگر ماناہےتو اس کے پورے احکام پر لازم ہے۔ مذہب کے کٹ پیس نہ بنائیے ورنہ مذہب کٹ جائے گا۔اور کٹ پیس والا پٹ جائے گا اپنے کو چوپٹ کرنے سے کیا فائدہ۔

ریڈی میڈ

سہولت ہر آدمی چاہتا ہے۔لیکن ہر خواہش اپنے محل اور موقع پر مناسب ہوتی ہے۔سہولت پسندی نے بے شمار ایجادیں کرائیں اوران گنت مشکلوں کو دور کیا۔سہولت پسندی نے ریڈی میڈ کپڑوں کا چلن شروع کیا۔ایک بار ناپ دیتے جاؤ۔دوسری مرتبہ ٹرائل دینے جاؤ۔تین بار ابھی تیار نہیں ہے کا جواب سن کر واپس آؤ۔اس سے اچھا ہے ریڈی میڈ کپڑوں کی دوکان پر جاؤ اور ایک نہیں دس جوڑے خرید لاؤ۔

لیکن سہولت پسندی نے چادر سے آگے پیر پھیلانا شروع کر دیئے جاہل قصابوں نے مولوی صاحب سے چھری پر بسم اللہ پڑھوالی اور بسم اللہ والی چھری کو الگ بڑی احتیاط سے رکھا تا کہ بسم اللہ کی ضرورت نہ رہے۔بس پھینکی ہوئی چھری ایک گھر میں کافی ہے۔پھر پھینکی چھری ماڈرن بنی۔ذبح کرنے کی مشین ایجاد ہوگئی۔جو بسم اللہ کر کے چلادی گئی اور سب جانور شرعی طور پر ذبح ہوگئے پھینکی ہوئی چھری۔پھینکی ہوئی مشین میں تبدیل ہوگئی مگر پھر بھی کمی رہ گئی تھی۔جس کو حل کرنے والوں نے یوں حل کیا کہ غیر حلال شدہ جانور کا گوشت بسم اللہ کہہ کر کھاؤ۔بس اتنا کافی ہے۔بسم اللہ پڑھنے سے بھی بچت کا راستہ نکلا۔جانور جس مشین سے ذبح ہوں گے۔اس پر بسم اللہ لکھی ہوئی ہے۔بس ہینڈل گھمانے کی ضرورت ذبیحہ کے یہ ریڈی میڈ طریقے ایجا ہوگئے۔مگر مسلمان راضی نہیں ہوئے۔احتجاج کیا اور پھر مولوی صاحب ایک ایک جانور کو ذبح کرنے لگے۔کیل گھر

میں قصاب کو مولوی صاحب کہا جاتا ہے۔ کچھ مولوی قصابی کا کام کرتے ہیں مگر قصاب نہیں کلاتے۔ وہ جانور نہیں ذبح کرتے ہیں۔ خون بہنے نہیں دیتے ہیں۔ یہاں شریعت، شرافت، تقدس ذبح ہوتا ہے۔ اور جو انسان ذبح کئے جاتے ہیں۔ ان کو عقیدت عمل، ۔ جنت کی امید کے شاک لگا دیئے جاتے ہیں۔ وہ بے ہوشی میں ذبح ہوتے رہتے ہیں۔ خون کو چوس لینا خون کو بہنے دینے سے بہتر قرار دینا کیا بری بات ہے۔

ریڈی میڈ ذبیحہ کی مخالفت مسلمانوں نے اس لئے کہ کہ وہ حرام گوشت نہیں کھا سکتے۔ البتہ مال حرام میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ حرام گوشت دوسرے کے ہاتھوں حرام ہوا ہے اور مال حرام کو تو ہم نے خود حلال کیا ہے۔

ریڈی میڈ کے چلن نے شادی گھر بنوا دیئے۔ آرڈر دے دیجئے۔ شادی گھر بک کرا لیجئے۔ آیئے اور شادی کر کے چلے جایئے۔ علاوہ رقم کی ادائیگی کے کوئی اور کام نہ کرنا پڑے گا۔ مگر لوگ اب ریڈی میڈ شادی چاہتے ہیں کہ شادی ہوگئی ہے۔ نکاح پڑھوانا باقی ہے۔ جو کبھی پڑھوا لیں گے۔

لوگ ریڈی میڈ مذہب کی مانگ عرصہ سے کر رہے ہیں۔ روزہ نہیں رکھیں گے۔ روزانہ ایک غریب کو کھانا کھلا دیں گے۔ نماز نہیں پڑھیں گے۔ روپیہ چھوڑ جائیں گے مرنے کے بعد پڑھوا دینا، زکوٰۃ، خمس نہیں نکالیں گے، خیر خیرات کر دیں گے۔ گھر بھر بے نماز ہے۔ سب سو رہے ہیں۔ مگر صبح کو مولوی صاحب برکت کے لئے ایک پارہ قرآن مجید کا پڑھ جاتے ہیں۔ پہلے سیٹھ ان کو پانچ روپیہ دیتے تھے۔ اب دس کر دیئے ہیں۔ عید کے دن کپڑے بھی بنا دیتے ہیں۔ مولوی صاحب بھی سیٹھ صاحب کے سامنے اتنا جھکے جاتے ہیں جتنا خدا کے سامنے بھی نہیں جھکے تھے۔ سیٹھ صاحب بھی مولوی

صاحب کا کندھا پکڑ کر کہتے ہیں کہ ہم تو گناہ گار آدمی ہیں لیکن مولوی صاحب کا کندھا پکڑ کر جنت میں چلے جائیں گے۔ سیٹھ صاحب کے مرنے پر مولوی صاحب بھی کہہ رہے ہیں بڑا جنتی آدمی تھا جب کسی کے لئے کچھ مانگا کبھی انکار نہیں کیا۔

مگر سیٹھ صاحب جنت میں کیسے جائیں گے۔ مولوی صاحب کا کندھا تو ابھی دنیا میں ہے اور دنیا کا بوجھ لادے ہے۔ قربانی کا بکرا جنت پہنچا دے گا۔ اسی لئے حج کبھی یاد نہیں آیا اور قربانی کبھی فراموش نہیں ہوئی۔ کیونکہ حج میں کوئی مقابلہ نہیں ممکن ہے۔ بکرے کی خریداری میں مقابلہ بھی ممکن ہے اور لوگوں سے تعریفیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ حکم خدا پر نہیں چلیں گے۔ البتہ جلتی زمین پر یا آگ پر چل کر سارے گناہ بخشوا لیں گے۔ مجلس آنے جانے میں بڑی زحمت ہے۔ کیسٹ سن لیں گے۔ وی ڈی او میں ذاکر کو بھی دیکھ لیں گے۔ گھر میں چلتے پھرتے سن لیں گے۔ کھانا کھاتے ہوئے سن لیں گے۔ مجلس میں بھی کب دل لگتا ہے یہاں بھی دو چار فقرے کان میں پڑ ہی جائیں گے۔ ثواب کچھ تو مل ہی جائے گا اور سب کام بھی جاری رہیں گے۔ مجلس جاتے میں تو بڑا ٹائم ویسٹ ہوتا ہے۔ شب عاشور بیگم سب تعزیوں پر نذرانہ چڑھا آتی ہیں۔ جس کی ایسی جنتی بیوی ہو اس کا شوہر جنت سے محروم رہے گا۔ یہ اور ایسے ہی تمام تصورات ریڈی میڈ مذہب کے ذریعہ کام چلانے کی غلط کوشش ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اگر ریڈی میڈ مذہب سے کام چل جاتا تو شریعت حلال و حرام و واجبات کی پابندیاں عائد نہ کرتی اور ان پابندیوں کو بحال رکھنے کے لئے حسینؑ اتنی بڑی قربانی نہ دیتے۔

ڈھیل تباہی کی جھیل

سختی اور نرمی دونوں کی ضرورت پڑتی ہے چاہے گھر سنبھالنا ہو چاہے معاشرہ یا ملک سنبھالنا ہو۔لیکن بے جا سختی اور بے جا نرمی دونوں فرد کو گھر کو خاندان کو، ملک وقوم ومعاشرہ کو تباہ کردیتی ہیں۔ بے جا نرمی کا نام ڈھیل ہے جو بے شک وبلا شبہ تباہی کی جھیل ہے۔ بے شمار بچے جوان، عورتیں، کارخانہ، کاروبار، اسکول، کالج، حکومتیں اور قومیں اسی ڈھیل کی جھیل میں ڈوبی اور تباہ ہوئی ہیں اور ایسی تباہ ہوئی ہیں کہ آج ان کا نہ کوئی نام ہے نہ کوئی نشان، نہ کوئی اثر ہے نہ کوئی یادگار، نہ کوئی ذکر باقی ہے نہ کسی کو ان کی فکر ہے۔ وہ خود بھی ڈوبے اور اپنے ہر ہمنوا کو بھی لے ڈوبے۔ تباہی کی اس جھیل میں ہزاروں سال کی تاریخیں، تہذیبیں، اور تمدن ڈوبے پڑے ہیں اور اس طرح سڑگل گئے ہیں کہ سوائے فرشتوں کے لکھے نامہ اعمال کے کہیں ان کا اتہ پتہ نہیں ہے۔ ڈھیل ہمیشہ شخصیت پرستی، خاندان پرستی، نسل پرستی اور مفاد پرستی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ہمیشہ اصول وقانون واحکام کی خلاف ورزی کراتی ہے۔ اللہ کے یہاں ظالم کی رسی دراز ہوسکتی ہے لیکن دین ومذہب وشریعت میں ذرہ برابر ڈھیل نہیں ہوسکتی ہے جس کی سب سے واضح مثال شیطان کی ہے۔ جس کی رسی دراز ہے۔ جسے ایک معین دن تک کی چھوٹ دی گئی ہے۔ یہ معین دن اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک ہر شیطنت اور ہر شیطان کا مٹانے والا اور پوری کائنات پر اللہ کی سلطنت کا قائم رنے والا ظہور نہیں کرتا ہے۔ بعد ظہور شیطان مٹ

جائے گا۔ مگر رسی کے دراز ہونے کے باوجود اللہ نے حکم کی خلاف ورزی پر ایک سکنڈ کی ڈھیل نہیں دی۔ بلکہ اسی وقت اسے جنت سے نکالا۔ لعین اور رجیم قرار دیا۔ دوزخ کو اس کا ٹھکانہ قرار دیا ایک شیطان ہی کا واقعہ نہیں ہے بلکہ پوری تاریخ دین یہی ہے کہ اللہ کے کسی عہدہ دار نے کسی نبیؐ اور امامؑ نے رتی برابر ڈھیل نہیں دی۔

جب طوفان جناب نوحؑ آ گیا۔ ظالموں کی مہلت ختم ہوگئی۔ جن کی رسی دراز تھی۔ ان کے ہلاک ہونے اور ڈوبنے کا دن آ گیا۔ صرف جناب نوحؑ کی کشتی نجات کا ذریعہ رہ گئی تو جناب نوحؑ نے اپنے نافرمان بیٹے کو آواز دی آج سوائے کشتی کے کوئی کسی کو نہیں بچا سکتا۔ مگر بے عمل، بدعمل، بدروح بیٹے نے اپنے باپ کا کہنا نہیں مانا۔ بزرگوں کے نام نیک پر کلنک کا ٹیکہ بننے والا ناخلف پسر نوحؑ ڈوبا اور ہر عہد کے ناخلف کے لئے ضرب المثل بن گیا۔ جناب نوحؑ جانتے تھے کہ بدعقیدہ وبدعمل بیٹا آج طوفان میں ڈوبے گا اور کل دوزخ میں جلے بھنے گا مگر صرف اس لئے کہ کسی ڈھیلے ایمان اور گمراہ عقیدہ والے کے دل میں کوئی کور کسر دین کے بارے میں نہ رہ جائے آپ نے خدا سے کہا کہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے لہٰذا اس کی نجات ہوجائے اور خدا نے یہ جانتے ہوئے کہ جناب نوحؑ معصوم ہیں۔ علم ومعرفت میں اولوالعزم رسولؐ کے درجہ پر فائز ہیں جواب میں کہا کہ یہ نااہل ہے۔ بدعمل ہے لہٰذا اس کا شمار تمہارے اہل میں نہیں ہوسکتا۔ بلکہ نااہل کی نجات کی بات کرنے والے کا شمار جاہلوں میں ہوجائے گا۔ گفتگو جناب نوحؑ سے نہ تھی بلکہ ان کے ذریعہ ہم سے تھی کہ مذہب میں ڈھیل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نبی کا بیٹا نہیں بچ سکتا ہے۔ نبی بھی نہیں بچا سکتا ہے۔ بلکہ اپنی بلند منزلت ونبوت کے بچانے کے لئے نااہل کے بچانے کی بات بھی نہیں کرسکتا ہے۔ یہ گفتگو بے عمل پر آمادہ کرنے

والے افراد کے لئے قابل عبرت ہے کہ وہ اپنے لئے اور اپنے ہمنواؤں کے لئے کیسی آگ بو رہے ہیں۔

جناب نوحؑ اور جناب لوطؑ کی بیویوں پر عذاب آیا۔ مرسل اعظمؐ کے گھر میں رہنے والی دو خاتونوں کے لئے خدا نے کہا کہ تمہارے دل ٹیڑھے ہیں تمہارا انداز فکر اور تمہارا پیمانہ آرزو گمراہ ہے اللہ نے ان کرداروں کو اسی لئے بے نقاب کیا کہ نبیؐ کے گھر میں جگہ پانے کے باوجود بھی کوئی ڈھیل نہیں ہے۔ خدا نے منافقین کے لئے اپنے محبوب نبیؐ سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہہ کر کہ چاہے تم دعائے مغفرت کرو یا نہ کرو۔ خدا معاف کرنے والا نہیں ہے۔ ہم کو یہی بات سمجھائی ہے کہ اصول شریعت سے منحرف، احکام الٰہ کے مقابلہ پر من مانی کرنے والی ہر شخصیت کا ٹھکانہ دوزخ میں ہے اس لئے ہے کہ مذہب میں کوئی ڈھیل نہیں ہے۔

خود حضورؐ نے منبر سے زندگی کی آخری تقریر کرتے ہوئے جب کہا کہ میری عمر آخر ہے۔ تم میں سے جو شخص کوئی حاجت رکھتا ہو بیان کرے تا کہ میں اس کے لئے دعا کروں تو ایک شخص نے کھڑے ہوکر کہا کہ میں منافق ہوں میرے لئے ایمان کی دعا فرمائیں۔ حضرت کی دعا سے قبل ایک عظیم تاریخی وحکومتی شخصیت نے اس شخص کی یہ کہہ کر مذمت کی کہ تو نے اپنے منافق ہونے کا اعلان کر کے اپنے کو ذلیل کر لیا۔ مگر حضور نے اسی سکنڈ اس شخصیت کی بدترین وسخت ترین مذمت کی کہ اس نے اپنے کو آخرت کی رسوائی سے بچانے کے لئے اپنا حال بیان کر کے مجھ سے دعا چاہی اور تم نے آخرت بھلا دی۔ تم کو صرف دنیا کی عزت وذلت کا خیال رہا اور بس۔ لہٰذا یہ شخص قابل تعریف ہے۔ میں اس کے لئے دعا کرتا ہوں۔ البتہ تم روح اسلام سے بے خبر ہو اور آخرت کی رسوائی کو بھول

گئے ہو۔ تم کو صرف دنیا ہی یاد ہے تم قابل مذمت ہو اور یہ شخص قابل تعریف ہے۔ اس نے وہ کہا ہے کہ جس کے ہم خواہشمند ہیں۔ جو ہمارے مشن کے عین مطابق ہے۔ شخصیت کو چھتڑا کر دینے والی رسولؐ کو اس تقریر اور دعائے ایمان نے ہر طرح یہ بات سمجھا دی کہ ڈھیل تباہی کی جھیل ہے۔

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے ملاقاتیوں کے لئے چراغ گل کر کے اس گمراہ خیال کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیا کہ اسلام میں ڈھیل ہو سکتی ہے۔ چراغ میں تیل بیت المال کا تھا لہٰذا صرف اتنی دیر جلا جتنی دیر حضرتؑ نے بیت المال کا حساب لکھا۔ حالات کے دباؤ میں آخر اصول واخلاق احکام شریعت میں ڈھیل ڈالنے والے۔ چشم پوشی کرنے والے، مصلحت کا لحاظ کرنے والے سب ایک طرف سے حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کو مشورہ دے رہے تھے کہ ظالم گورنروں کو نہ ہٹائیں ورنہ حکومت ہل جائے گی۔ مگر آپ نے اپنے اعلان کے مطابق ہر ظالم گورنر کو ہٹا دیا کیونکہ آپ نے اپنی حکومت کے پہلے دن کہا تھا کہ مین اس وقت تک چین نہ لوں گا جب تک ظالم کو اتنا کمزور نہ کر دوں کہ وہ حق دیدے اور مظلوم کو اتنا طاقتور نہ کر دوں کہ وہ ہر ظالم سے اپنا حق لے لے۔ علیؑ کا یہی انصاف اس عہد کے مسلمان برداشت نہ کر سکے۔ آپ نے اپنی بات پر جان دیدی مگر غلط بات نہ مانی۔ علیؑ کی شہادت کا سبب ان کا عدل تھا۔ جب کہ عموماً لوگ اپنے ظلم کی وجہ سے قتل ہوتے ہیں۔ مولیٰ علیؑ کی پوری زندگی، پوری تعلیم، پوری کوشش، ساری محنت کا ماحصل یہی ہے کہ مذہب میں، احکام شریعت میں کوئی ڈھیل نہیں ہے۔ کیونکہ ڈھیل تباہی کی جھیل ہے اور اسلام انسانوں کو تباہی کی جھیل سے نکالنے آیا ہے۔ امامت کے مشن کی جب عہد ظہور میں تکمیل ہوگی تو سب سے پہلے وہ لوگ قتل ہوں گے جو

علماء کے بھیس میں گمراہی کے مبلغ ہوں گے اور آخر میں ہر دین سے جاہل اور شریعت سے غافل شخص قتل ہو جائے گا ڈھیل کا خاتمہ ہو جائے گا اور شریعت اسلامیہ کا کامل مکمل نفاذ ہو جائے گا۔

سال کے بارہ مہینوں میں رمضان کا مہینہ ممتاز مہینہ ہے۔ یہ رحمت کا مہینہ ہے اگر انسان دین کی پابندی کرے رمضان بھر روزہ رکھے۔ ورنہ یہ مہینہ عذاب کا مہینہ ہے۔ ہمارے معاشرے کے اکثر افراد اس مہینہ میں اپنی تباہی کی جھیل اور زیادہ گہری کر لیتے ہیں۔ بے روزہ چوتھے دن واجب القتل ہے اور اس کی تباہی کی پہلی جھیل قبر ہے۔ دوسری جھیل برزخ ہے، تیسری جھیل محشر ہے اور اس کی منزلیں ہیں اور آخری جھیل آگ کی جھیل ہے جہاں کا پانی بھی آگ ہوگا۔ رحمت کا مہینہ آ گیا ہے عذاب سے بچو اور رحمتیں حاصل کرو۔ کسی بے روزہ دار کو کھانا، پانی ناشتہ کچھ نہ دو چاہے شوہر ہو یا باپ بھائی ہوں، مہمان ہو یا گھر کا آدمی ہو۔ میکہ کا ہو یا سسرالی۔ اسے بھی دوزخ سے بچاؤ اور خود بھی آگ سے بچو۔

زیادہ نہ ہنسئے گا ورنہ روئیے گا

آدمی مٹی سے بنا ہے۔ مٹی زمین سے اٹھائی گئی ہے۔ بلندی سے بھی اٹھائی گئی اور پستی سے بھی۔ پہلے ہر طرح کی مٹی لی گئی پھر سب کو ملا کر آدمی بنا۔ آدمی کے پیکر کو ربانی روح سے منور کیا گیا۔ جب آدمی کی نسل چلی تو خاکی آدمی کے خون میں اپنی جنیہ ماں کا آتشی لہو بھی شامل ہوا۔ اور حوریہ کی اولاد میں ماں کے جنتی دودھ کی نہر بھی جاری ہوئی۔ آگے چل کر جنیہ اور حوریہ کی اولادیں مخلوط ہو گئیں۔ شیطان بھی اپنا زہر انسانی رگوں میں گھولتا رہا حرام کاری کے ذریعہ زندگی کے پاکیزہ دریاؤں میں گندے نالے بھی گرتے رہے جو آگے چل کر دریا میں شامل ہو گئے مگر ان کی گندگیاں بھی شامل رہیں۔ خارج نہ ہو سکیں اس لئے آج ہم انسانوں کو اتنی طرح کا اتنی قسم کا دیکھتے ہیں کہ انسان کی قسموں کا شمار ناممکن ہے بلکہ ایک آدمی اپنی زندگی میں کتنی قسم کا نکلے گا اس کا احاطہ بھی ممکن نہیں ہے۔ کبھی بلندی کی مٹی اپنا عروج دکھاتی ہے کبھی پستی کی مٹی اپنی گراوٹ کا مظاہرہ کرتی ہے۔ کبھی ربانی روح زندگی کو ایسی روشنی ایسی خوشبو ایسا رنگ، ایسا نکھار دیتی ہے کہ بس دیکھا کیجئے۔ ایسوں کو دیکھتے ہی روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ ان کو دیکھتے ہی آدمیت میں وہ بال و پر نکل آتے ہیں کہ رضائے رب کی طرف پرواز شروع ہو جاتی ہے۔ ایسی زندگیوں کو دیکھا بھی ثواب ان کے پاس بیٹھا رہنا بھی عبادت، ان سے قربت بھی شرف، قرابت بھی عزت، ان سے وابستگی سعادت ان سے دوری شقاوت و بدنصیبی مگر

دنیا کے اس عجائب گھر میں صرف روحانی زندگی کے مجسمے نہیں ہیں بلکہ وہ آتشی اور آگ بگولہ انسان بھی ہیں جن کو دیکھ کر جن بھی سوچتے ہیں کہ یہ قلمی جن تخمی جن سے بھی گرم تر نکلا۔ آتش مزاج انسانوں کے درمیان وہ حورصفت زندگیاں بھی ہیں جو نہ گرم ہوتی ہیں نہ گرم ہونے دیتی ہیں ان کا حلم غصہ پر غالب، ان کا معاف کردینے کا جذبہ خطاؤں پر غالب، ان کا وقار مضمحل نہیں ہوتا۔ ان کو کوئی چڑ چڑا بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ حالات کا دریا کتنا ہی کیوں نہ اتر جائے مگر یہ بلند مرتبہ افراد اپنی بلندیوں سے نیچے نہیں اترتے۔ وقار انسانی کی ان سربلند چوٹیوں کے نیچے شیطانی کارناموں کے وہ اندھے غار بھی ہیں جس مین ایک سے ایک زہریلا انسان پایا جاتا ہے جو ایک دوسرے کو ڈس رہے ہیں۔ ڈنک مار رہے ہیں۔ ان غاروں کے نیچے خودغرض تجارت، ظالم حکومت، فریب کار سیاست، نفع خور صنعت کے وہ پرخطر جنگل بھی ہیں جہاں درندہ صفت انسان ایک دوسرے کو بھبھوڑ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کا لہو پی رہے ہیں۔ گوشت نوچ رہے ہیں، ہڈیاں چبا رہے ہیں کبھی چھوٹے بڑوں کا شکار ہوتے ہیں کبھی لومڑیاں، ہاتھی، اور شیر کو گڑھے میں گرا لیتی ہیں۔ ان جنگلوں کے آگے وہ انسان بھی آباد ہیں جن کو زندگی میں حشرات الارض کا درجہ دیا گیا ہے۔ وہ خود بھی اپنے بلوں سے باہر آنے پر تیار نہیں ہیں۔ ان کو اگر سمجھاؤ کہ تم بھی عظیم انسان بن سکتے ہو تو اپنے سمجھانے والوں کو سمجھاتے ہیں کہ ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دیجئے۔ بھیا کہ بات ورنہ ہم کہاں اور باعزت زندگی کہاں۔ ان کو کوئی بتائے کیا۔

انسان کی پیدائش سے لے کر آج تک کی انسانی زندگی کے یہ مختلف روپ تھے جن کا خلاصہ پیش کیا گیا۔ لہٰذا ایسے انسانوں کے درمیان رہنے والے انسان کسی حال پر

بھروسہ نہ کر۔ ہر حال میں ماضی بن جائے گا کسی مستقبل کے لئے بدحال نہ ہو ہر مستقبل کسی نہ کسی دن کسی نہ کسی حال کی صورت میں تیرے پاس آئے گا اور پھر تجھے چھوڑ کر تیرے ماضی سے جا ملے گا۔ کون دوست کب دشمن ہو جائے گا کون دشمن کل دوست ہو جائے گا کوئی قریب بعید بھاگے گا۔ کون اقرب عقرب بن جائے گا۔ کون معتمد دھوکا دے گا۔ کون مخدوش کب مضبوط سہارا بن جائے۔ صحت کب بیماری میں تبدیل ہو جائے گی۔ درد کب مسکراہٹوں کے لبوں پر دم توڑ دیں گے۔ مال کب ہاتھ ملنے پر مجبور کر دے گا۔ کون سے خالی ہاتھ کب مالا مال ہو جائیں گے کون گمنام آسمان شہرت کا سور بن جائے گا اور کس کا سورج کب غروب ہو جائے گا۔ کسی کو کسی کا حال کچھ نہیں معلوم اور دوسرے کا حال کیا معلوم ہو گا جب اپنا ہی حال نہیں معلوم۔

لہٰذا زندگی کو ہمیشہ حدوں کے اندر رکھنا ضروری ہے حکیم اسلام امیر کائنات مولائے متقیان نے فرمایا کہ کبھی کسی کو اتنا راز دار نہ بناؤ کہ اگر کبھی وہ دشمن ہو جائے تو تمہارے راز اس کے قبضہ میں ہوں اور تم اس کے ہاتھوں میں بے بس ہو جاؤ۔ اور وہ تم سے منہ مانگی قیمت وصول کرتا رہے۔ اسی طرح کسی سے اتنا نہ لڑو کہ جب حالات ایک دوسرے کو باہم دوست بنا دیں تو لڑائی کی خلیج پائی نہ جا سکی ایک دوسرے کو لگائے ہوئے چر کے مندمل نہ ہو سکیں۔

مولیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہی ہے کہ اعتدال کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اکثر لوگ حالات پر کبھی اتنے خوش ہو جاتے ہیں کہ بعد میں ان سے روئے نہیں رویا جاتا۔ کوئی کبھی کسی کو دوستی یا کسی کی قربت یا کسی کی رشتہ داری یا کسی کی خاطر داری پر اتنا خوش ہو جاتا ہے کہ بعد میں آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے۔

خداوند عالم سب کو خوشیاں نصیب کرے اور برے دنوں سے محفوظ رکھے مگر ہمارا بھی فرض ہے کہ کبھی حالات میں اتنے مگن نہ ہو جائیں کہ خدا، آخرت، مذہب، والدین، اعزاء، صاحبان حقوق، مومنین، غرباء، حاجت مند سب فراموش ہو جائیں اور جب حالات کی زمین پیروں کے نیچے سے کھسک جائے تو ہم نہ دین کے رہیں نہ دینا کے نہ اپنے پناہ دیں نہ غیر۔ زندگی کی ٹھوکروں کے ساتھ ہر شخص بطور صدائے بازگشت اپنی ٹھوکر لگانا فراموش نہ کرے۔ اس دن سے بچنا ہے تو آج سوچ کر چلو۔